ہندوستان کے بہترین افسانے

مرتب

حسن عبّاس رضا

منتخب

Dost

ہندوستان کے بہترین افسانے

(حصّہ اوّل)

مرتّب

حسن عبّاس رضا

دوست پبلی کیشنز - اسلام آباد

ضابطہ

ISBN : 969-496-107-6

کتاب	:	ہندوستان کے بہترین افسانے
مرتب	:	حسن عباس رضا
موسم اشاعت	:	۱۹۹۹ء
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	الساجد پرنٹرز
قیمت	:	140.00 روپے

دوست پبلی کیشنز 8 اے، خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958 ، اسلام آباد۔

کرشن چندر

کے نام

الف

ترتیب

پہلی بات	حسن عباس رضا	۷
کفن	پریم چند	۹
گھر میں، بازار میں	راجندر سنگھ بیدی	۱۷
رفوگر	دیوندر ستیارتھی	۲۵
کالو بھنگی	کرشن چندر	۴۳
پھول توڑنا منع ہے	کرتار سنگھ دگل	۵۸
مغل بچہ	عصمت چغتائی	۶۴
لال اور پیلا	خواجہ احمد عباس	۷۱
کارمن	قراۃ العین حیدر	۸۱
جگا	بلونت سنگھ	۹۴
رضو باجی	قاضی عبدالستار	۱۱۳
باہر کا آدمی	جوگندر پال	۱۲۳
ہزاروں سال لمبی رات	رتن سنگھ	۱۳۰
رونے کی آواز	سریندر پرکاش	۱۳۳

ب

موم کی مریم	جیلانی بانو	۱۳۹
قبر	رام لعل	۱۵۲
جب ہم نہ ہوں گے	بشیشر پردیپ	۱۶۴
درد کا ساحل کوئی نہیں	انور عظیم	۱۷۲
وہ	بلراج مین را	۱۹۴
پہیہ	غیاث احمد گدی	۲۰۰
ایک زخم اور سہی	مہندر ناتھ	۲۰۹
کینڈل کالونی	اقبال متین	۲۲۱
اَدّھا	گلزار	۲۳۲
اترن	واجدہ تبسم	۲۳۷

پہلی بات

بوڑھے برگد کے گھنے سائے تلے سجی چوپال میں چوکڑی مار کے بیٹھے ہوئے سامعین کے چہروں پر اتار چڑھاؤ' کہانی سنانے والے کے انداز بیان اور واقعات کے پیچ و خم کے ساتھ نت نئے روپ دھارتا رہتا..... اور پھر کہانی کے اختتام پر واہ واہ کے شور یا آہ کی ٹھنڈی صدا چوپال کو ویران کر جاتی..... یہ موجودہ عہد کے افسانے کا ابتدائی روپ تھا۔ جو کسی جہاندیدہ داستان گو کا مرہون منت تھا۔

پھر یوں ہوا کہ چوپالوں سے سفر کرتی ہوئی وہ کہانی حجروں' اطاقوں' اور ڈیروں تک آ پہنچی. ..... جہاں آگ کے الاؤ کے اردگرد بیٹھے سامعین اس لمحے کے منتظر رہتے جب داستان گو کسی نئی اور اچھوتی کہانی یا واقعے کا آغاز کرتا۔

وقت کا پہیہ اپنی پوری رفتار سے گردش کرتا رہا اور داستان رفتہ رفتہ واقعہ' کہانی' افسانے اور علامتی افسانے کے قالب میں ڈھلتی گئی..... بیسویں صدی کے آخری سنگ میل پر کھڑا' اور اکیسویں صدی کے نئے راستے پر قدم رکھتا ہوا افسانہ نگار محض سنے سنائے واقعات کی بنا پر کہانی سناتا یا اسے ضبط تحریر میں نہیں لاتا' بلکہ وہ اپنی ذات پر نازل ہونے والے عذابوں' اور کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے خوشی کے لمحات' حادثات' واقعات اور سانحوں کو بھی اپنی تخلیق میں سمو رہا ہے۔

آج کے افسانہ نگار کا مشاہدہ یا تجربہ ایک صدی پہلے کے داستان گو کے تجربات اور حافظے سے بہت مختلف ہے' وہ کہانی کہتا ہی نہیں' اس کو سہتا بھی ہے۔

زیر مطالعہ مجموعہ "ہندوستان کے بہترین افسانے" بھی ایسی ہی کہانیوں پر مشتمل انتخاب ہے۔ جس میں شامل افسانہ نگاروں نے زندگی کی کوکھ سے جنم لینے والی حسرتوں' مسرتوں' تمناؤں'

خواہشوں اور محرومیوں کو محض محسوس ہی نہیں کیا' ان کو برتا بھی ہے۔

پریم چند کا "کفن" ہو یا راجندر سنگھ بیدی کا "گھر میں' بازار میں" کرشن چندر کا "کالو بھنگی" ہو یا عصمت چغتائی کا "مغل بچہ" دیوندر ستیارتھی کا "رفوگر" ہو یا گلزار کا "ادھا" یا دیگر تمام افسانے۔ دراصل یہ سب ذات اور کائنات کی بھٹی سے کشید کئے ہوئے وہ تلخ گھونٹ ہیں جو محض سرور ہی نہیں بخشتے' دماغ کو گھما بھی دیتے ہیں۔

زیر مطالعہ مجموعے کے افسانوں میں ہندوستانی معاشرے' عوام کے رہن سہن' ان کی محرومیوں' ذات پات کے تعصبات اور عہد جدید کی معاشی ناہمواریوں کی تلخیاں آپ کو نہ صرف دکھائی دیں گی' بلکہ اپنی پوری توانائی سے محسوس بھی ہوں گی۔

سریندر پرکاش' اور بلراج مین را کا شمار اس وقت بھارت کے جدید ترین' مگر مقبول اور موثر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ . . . . . . سریندر پرکاش کا "رونے کی آواز" اور بلراج مین را کا "وہ" انسانی نفسیات' ذات کی شکست و ریخت' محرومی' تنہائی' اور رواں صدی کے معاشی مسائل کی کوکھ سے جنم لینے والے ایسے افسانے ہیں جو قاری کو بہت دیر تک سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

"ادارہ دوست پبلی کیشنز" کے آصف محمود نے باذوق قارئین تک اچھی' خوبصورت موثر اور یادگار کہانیاں بہم پہنچانے کے لئے ایک انتخابی سلسلے کا آغاز کیا ہے' اور "ہندوستان کے بہترین افسانے" اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے' جس کی جلد اول آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد "ہندوستان کے بہترین افسانے" کی دوسری جلد بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آپ تک پہنچ جائے گی۔ . . . . . اس کے علاوہ "پاکستان کے بہترین افسانے" "فسادات کے افسانے" اور "ایشیا اور افریقہ کے بہترین افسانے" بھی دوست پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہو چکے ہیں۔

میں بھارت کے ان تمام موجودہ افسانہ نگاروں کا تہہ دل سے ممنون ہوں' جن کے خوبصورت افسانوں کے باعث یہ مجموعہ قابل اعتبار ٹھہرے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے تمام قارئین کی آراء کا بھی منتظر رہوں گا' تاکہ ان کی روشنی میں موجودہ مجموعے میں رہ جانے والی تشنگی کو دوسری جلد میں دور کیا جائے۔

حسن عباس رضا

کفن

پریم چند

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں' ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجواں بیوی بدھیا درد زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی' فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا' جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا "مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔"

"تو بڑا بیدرد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا۔ اسی کے ساتھ اتنی بیوپھائی۔"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام' مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹے بھر کام کرتا تو گھنٹے بھر چلم پیتا۔ اس لئے اسے کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا' اور جب تک وہ پیسے رہتے' دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا

کام پا کر بھی قناعت کرلینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان کی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں' پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے مار بھی کھاتے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھا لیتے۔ یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے آلو بھون رہے تھے' جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہوگیا تھا' مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی۔ اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کرلیتی تھی۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے۔ بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے درد زہ میں مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مرجائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے" اس کی چڑیل کا پھسار ہوگا اور کیا' یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے۔"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا' بولا "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے۔ میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تمہیں جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن تک اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں' اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں' کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا' آج اس کا اکھڑا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ' گڑ' تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر

میں۔"

"سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو' جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں' وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے' گھر میں کچھ بھی نہ تھا مگر اس طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں تھا اور کسانوں کی سی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے یہ جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرپنچ اور مکھیا بنے ہوئے تھے۔ اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کر رہا تھا پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بیجا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا' اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھے۔ اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی' وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ وہ بولا "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھرپیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں' سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی' رائتہ' تین طرح کے سوکھے ساگ' ایک رسے دار ترکاری' دہی' چٹنی' مٹھائی اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی جو چیز چاہو مانگو۔ اور جتنا

چاہو کھاؤ لوگوں نے ایسا کھایا' ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا' مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی ہوئی کچوریاں ڈال دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے پتل کو ہاتھ روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ اٹے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بڑا پان بھی ملا مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ جھٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزا لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا؟ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو' کریاکرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے۔ مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی' اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔" آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے۔ جیسے دو بڑے بڑے اژدھے کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

○

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غمزدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے

نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علّت میں' وعدے پر کام نہ کرنے کی علّت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں نہیں رہنا چاہتے۔"

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھروالی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک۔ تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا' وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔"

زمیندار صاحب رحمدل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں "چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً۔ دو روپے نکال کر پھینک دیئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دے دیا کسی نے لکڑی اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے اور لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آ آکر لاش کو دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

○

بازار میں پہونچ کر گھیسو بولا۔ "لکڑی تو اسے جلانے بھر کی مل گئی ہے۔ کیوں مادھو۔"

مادھو بولا "ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کچھن چاہیے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کچھن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا! لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کچھن کون دیکھتا ہے۔"

"کیسا برا رواج ہے۔ کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے' اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔"

"اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً" ایک شرابخانہ کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک لی اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا " کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آکھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ "دنیا کا دستور ہے۔ یہی لوگ باہمنوں کو ہجاروں روپے کیوں دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے۔ پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں' ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے کپھن کہاں ہے۔؟"

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے بہت ڈھونڈا۔ ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔ "بڑی اچھی تھی بچاری مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں' گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے دوکان تھی' مادھو لپک کر دو پتوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا

اسے پن نہ ہوگا۔"

مادھو نے فرق صورت جھکا کر تصدیق کی' "جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا "کیوں دادا ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی" گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا' تو کیا کہوں گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر۔"

"پوچھے گی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے اسے کپھن نہ ملے گا؟ تو مجھے اب گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا' جو ہم دیں گے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔"

گھیسو تیز ہوگیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں؟"

"کون دے گا' بتاتے کیوں نہیں؟"

"وہی لوگ دیں گے جنھوں نے ابکی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمار ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اس طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی' میخانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا' کوئی بہکتا تھا' کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا' کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا' ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلّو میں ہی الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے تو صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ درگور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں

ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں' پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا تیل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا' جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور دینے کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا' اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔ گھیسو نے کہا "لے جا کھوب کھا اور آشیرباد دے' جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا آشیرباد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے آشیرباد دے' بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔" مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "وہ بیکنٹھ میں جائے گی۔ دادا بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔" گھیسو کھڑا ہوگیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں نہ جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے' جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کے دھونے کے لئے گنگا نہاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا.... نشہ کی خاصیت سے یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا "مگر دادا بیچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا! کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے.... ٹھگنی کیوں نینا جھمکا دے ٹھگنی۔

سارا میخانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی' کودے بھی' گرے بھی' مٹکے بھی' بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشے سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

گھر میں، بازار میں

راجندر سنگھ بیدی

دیوار پر لٹکتے ہوئے "شیکوشا" نے صبح کے آٹھ بجا دیئے۔ درشی نے آنکھ کھولی اور ایک سوالیہ نگاہ سے نئے، آبنوسی کلاک کی طرف دیکھا جس کی آٹھ سریلی ضربیں اس کے ذہن میں گونج پیدا کرتی ہوئی ہر لحظہ مدھم ہو رہی تھیں..... ایک گھٹیا سا قالین تھا اور یہی ایک کلاک جو درشی کے استاد نے اسے شادی کے موقع پر بطور تحفہ دیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی شاگرد ایک اچھی بیٹی ہونے کے علاوہ ایک اچھی بیوی بھی ثابت ہو جائے..... اور ہر روز صبح شیکوشا اپنے مستقل، طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا کہہ دیتا۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں، لیکن اب تو آٹھ بج گئے ہیں۔ سست لڑکی!"

درشی کا پورا نام تھا پریہ درشی۔ پریہ کا مطلب ہے پیاری اور درشی کا مطلب ہے..... دکھائی دینے والی یعنی جو دیکھنے میں پیاری لگے، دل کو لبھائے، آنکھوں میں نشہ پیدا کرے..... شاید اسی لئے درشی کو رات بھر جاگنا پڑتا تھا اور شیکوشا سے نظریں چرانا ہوتیں..... درشی بچپن ہی سے عصبی طور پر نحیف اور ضرورت سے زیادہ حساس تھی اور اب شادی کے بعد محبت کی بے اعتدالیوں سے وہ نسوں کی اور بھی کمزور ہو گئی۔

سسرال میں چند دن کے بعد جو سب سے بڑی دقت درشی کو پیش آئی۔ وہ اپنے خاوند رتن لال سے پیسے مانگنا تھی۔ اس سے پہلے وہ اپنے باپ سے بلا تامل پیسے مانگ لیا کرتی تھی اور اگر کبھی وہ اپنے مریضوں کے کام میں چوک بھی جاتے تو درشی ان کی لاڈلی بیٹی، ان کے کوٹ کی جیب میں سے ضرورت کے مطابق نکال لیا کرتی۔ "پاپا" کا کوٹ ہمیشہ زنانے میں کسی پیٹی کوٹ

کے اوپر ٹنگا ہوا مل جاتا تھا۔ اپنے میکے سے جتنے پیسے وہ ساتھ لائی تھی۔ وہ سب شگن کے پیسوں سمیت ایک خوبصورت طلائی گھڑی پر ختم ہو چکے تھے۔ خرچ کی یہ مد وہ رتن سے چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ رتن سے ضرورت کے مطابق پیسے مانگتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔ جب ان کی روحوں کا ملاپ ہوگا' تب وہ پیسے مانگ لے گی۔ اس صورت میں وہ پیسے مانگ کر بکنا نہیں چاہتی تھی۔

کئی دفعہ بازار میں کسی چیز کی خرید ہوتی تو درشی اپنی پتلی پتلی' نازک' کانپتی ہوئی انگلیاں اپنے صابر کے خوبصورت' لیکن خالی بٹوے میں ڈال دیتی اور کہتی..... "چھوڑیئے' رہنے دیجئے..... پیسے میں دوں گی۔"

رتن لال اسی وقت درشی کا ہاتھ تھام لیتا اور سیلزمین سے نظریں چراتا ہوا' محبت کے انداز سے درشی کی طرف دیکھتا اور کہتا۔

"ایک ہی بات تو ہے' درشی"

اس وقت درشی محبت کی ایک پر لطیف ٹیس محسوس کرتے ہوئے چپ ہو جاتی اسے یقین تھا کہ رتن کبھی بھی اسے پیسے ادا کرنے نہیں دے گا۔ کیا وہ اس کی بیوی نہیں ہے؟ آخر کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ خود ہی اس کے تمام چھوٹے موٹے خرچوں کا کفیل ہو؟

ان دنوں برسات شروع تھی اور رتن کا برساتی کوٹ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ بارش کے قطرے اس میں کسی نہ کسی طرح گھس ہی آتے تھے۔ اسے خریدنے کے لئے درشی اور رتن بازار گئے۔ سوشیکا سٹور میں انہیں ایک اچھا سا کوٹ مل گیا۔ قیمت طے ہونے سے پہلے درشی نے حسب دستور بیگ کے بٹن کھول دیئے اور بولی۔ "پیسے میں دیتی ہوں' رہنے دیجئے۔"

رتن لال نے اپنے ہاتھوں میں دس کا نوٹ مسلتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تمہارے پاس ریزگاری ہو گی؟"

درشی گھبرا گئی۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے یونہی کچھ دیر کے لئے بیگ کو ٹٹولا اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوہ! بھول گئی میں..... ریزگاری تو میرے پاس بھی نہیں۔"

رتن لال نے اسی اثنا میں انگلی کے گرد نوٹ کے بہت سے چکر دے ڈالے اور عصبی طور پر کمزور درشی خاموش رہنے کی بجائے کہنے لگی۔ "ریزگاری تو گھر ہی رہ گئی..... میرے پاس تو یہ پانچ پانچ کے نوٹ ہوں گے۔"

درشی نے غالباً یہی سمجھا کہ رتن لال پھر ایک دفعہ میٹھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھے گا اور پھر پیسوں کی ادائیگی کا سوال ہی نہیں اٹھے گا۔ لیکن وہ یہ بھول ہی گئی کہ شادی کو ایک ماہ سے کچھ زائد عرصہ ہو چکا ہے اور اب تکلّف کی چنداں بات نہیں رہی۔ رتن نے کوٹ کو اتارتے ہوئے کہا۔

"تو اچھا' پانچ پانچ کے دو نوٹ ہی دے دو' یہ لو' رکھ لو دس کا نوٹ۔"

اس وقت درشی کے کان گرم ہو گئے' جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے بلا وجہ برساتی کو ادھر ادھر الٹانا شروع کر دیا۔ برساتی کے ایک کنارے پر سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں اسے نجات کی راہ دکھائی دی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے نہایت خشمگیں انداز سے کہا۔

"یہ تو پھٹی ہوئی ہے..... کوڑی کام کی نہیں یہ۔"

اور پھر دکاندار کو مخاطب ہوتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔ "بھلا آپ نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے جی' جو پھٹا وا کوٹ ہمیں مڑھ رہے ہیں؟"

سیلزمین بالکل گھبرا گیا اور فوراً نئے کوٹ لینے کے لئے دکان کے اوپر چلا گیا۔ درشی کی برہمی کی وجہ سے رتن بھی سہم گیا اور ایک مصنوعی غصے سے دوکاندار کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت درشی نے رتن کو بازو سے پکڑا اور باہر لے آئی۔ سامنے سیڑھی پر سیلزمین برساتیوں کے بوجھ سے لدا ہوا اسٹاک روم سے نیچے اتر رہا تھا۔ لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ حسین جوڑا نظروں سے غائب ہو چکا تھا.....

رتن نے دیکھا درشی کے منہ پر سیاہی بکھر گئی تھی اور ماتھے پر ایک بڑے سے قرمزی دھبے میں سے پسینہ کے قطرے بے تحاشہ امڈ رہے تھے۔ بازار سے لے کر گھر تک اس کی بیوی لکنت بھری باتیں کرتی رہی..... اور رتن اس کی ایک بات کا بھی مطلب نہ سمجھا اور جب اس نے تانگے پر سے ہاتھ دے کر درشی کو اتارا تو اسے معلوم ہوا کہ درشی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے..... اور چونکہ وہ عورت کے سیدھے سادے تسلسل کی ایک کڑی کھو بیٹھا۔ اس نے مرد کی دیرینہ عادت کے مطابق کہنا شروع کیا..... عورت ایک معمّا ہے۔ شوپنہار کہتا تھا.....

اگلے دن درشی سو کر اٹھی تو آٹھ کی بجائے آٹھ پینتیس ہو چکے تھے اور سورج ان کے دریچہ پر آ گیا تھا۔ اس کی شعاعیں کلاک کے شیشے میں سے منعکس ہوتی ہوئی درشی کے چہرے پر

پڑنے لگی تھیں۔ کلاک کے بڑے بڑے رومن ہندسوں میں خالی سفید جگہ بڑے بڑے دانت بن گئی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے شیکوشا طنز کی حد سے گزر چکا ہے اور کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔

..... اور شیکوشا اکیلا ہی نہ ہنسا۔ اس کے ساتھ گکو کی ماں بھی تو شریک ہو گئی تھی۔ گکو کی ماں رتن کے ہاں ملازمہ تھی اور ایک بیوہ عورت تھی۔ صبح جب وہ چائے لے کر آئی تو رانی جی کو یوں تھکے تھکے دیکھ کر "خی غی..... غی خی" کے انداز سے ہنسنے لگی۔ گویا کہہ رہی ہو ہم بھی بہت دن گئے جاگا کرتے تھے۔ ہماری آنکھوں میں بھی خمار ہوتا تھا اور اب تو راتوں کو جگانے والے بھگوان کے دوارے ہی چلے گئے آہ! مجھے وہ دن یاد ہے جب وہ میرے لہنگے کے لئے بہت سندر گوٹا اور کنگری لائے تھے..... اس دن تو وہ پہلے اندر ہی نہیں آئے۔ دروازے پر ہی کھڑے مسکراتے رہے اور جب اندر آئے تو ان کا بات کرنے کا ڈھنگ بھی عجیب تھا اور وہ گوٹا دیکھ کر میری سب تکان اتر گئی تھی۔

درشی نے چلّاتے ہوئے کہا۔ "گکو کی ماں!"

گکو کی ماں کے لبوں پر تبسم نہیں رہا۔ صرف اس کا سایہ رہ گیا' ہلکی سی سرخی سے اس کا رنگ سپیدی اور سپیدی سے زردی اور سیاہی مائل ہو گیا اور وہ حیرت سے کلاک کی ٹک ٹک کو سننے لگی۔ درشی کے لئے وہ معمولی ٹک ٹک ہتھوڑے کی ضربوں سے کم نہ تھی۔ استاد کی عزت ملحوظ خاطر نہ ہوتی تو وہ پتھر مار کر اس کی ٹک ٹک کو روک دیتی..... گکو کی ماں سوچ رہی تھی کہ آخر مالکن کیوں خفا ہو رہی ہے حالانکہ رتن بابو نے اسے ایک نئی ساڑھی خرید کر لا دی ہے۔ جس پر پورا ایک ہاتھ چوڑا طلائی باڈر لگا ہے اور اس کے اندازے کے مطابق اس کی تمام تھکاوٹ دور کر دینے کے لئے کافی ہے۔

درشی نے کہا۔ "آج پھر تو نے چمچہ بھر چائے کے پانی میں دودھ کی گاگر انڈیل دی۔"

گکو کی ماں نے سہمے ہوئے کہا۔ "رتن بابو نے کہا تھا' رانی"

"کیا کہا تھا انہوں نے؟"

"کہا تھا..... رانی بیمار ہے۔"

گکو کی ماں نے ٹرے اٹھائی اور آنکھوں سے ایک ہاتھ چوڑے طلائی باڈر کو دیکھتی اور دل میں بھگوان کو کوستی ہوئی چلی گئی۔ درشی سوچنے لگی کیا رتن کو اس کی کمزوری کا پتہ چل گیا ہے؟ اسی لئے تو وہ اس قسم کی چائے کو میرے لئے غیر مفید سمجھنے لگا ہے اور کیا معلوم جو اس نے سوتے میں میرے بیگ کی تلاشی بھی لی ہو۔ اس نے زناٹے سے ایک ہاتھ سرہانے کے نیچے مارا۔

بیگ موجود تھا اور تھا بھی جوں کا توں بند..... بیگ کے ایک کونے میں جھومروں کی ایک جوڑی پڑی تھی۔ درشی جھومروں کی بہت شوقین تھی۔ لیکن اس کے بیاہ میں جتنے بھی زیور دیئے گئے تھے وہ سب کے سب وزنی تھے اور دیہاتی طرز کے بنے ہوئے۔ اکیلے جھومر ہی ڈیڑھ تولہ کے تھے۔ درشی جانتی تھی کہ رتن ان لمبے جھومروں کو پہنے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ خود بھی رتن کو خوش رکھنا چاہتی تھی لیکن اس بات کا کیا علاج کہ وزنی جھومر پہننے سے اسے اپنے کان ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور وہ انہیں نصف گھنٹہ سے زیادہ دیر تک نہیں پہن سکتی تھی۔

پریہ درشی کی خواہش تھی کہ وہ ہلکے سے جھومر خرید لیتی۔ یہی کوئی سستی سی جوڑی۔ لیکن ان کے لئے وہ رتن سے پیسے نہ مانگے گی۔ تاوقتیکہ وہ خود اپنے فرض کو محسوس کرتا ہوا پیسے اس کے ہاتھ میں نہ دے دے۔

معاً" اس کا خیال پاپا کی طرف چلا گیا۔ ان سے تو وہ پیسے لڑ کر بھی مانگ لیتی تھی ۔ کسی خیال کے آنے سے درشی اٹھی اور اپنے ہی کمرے میں جب اس نے الماری کھولی تو اس کی جارجٹ کی ساڑی کے اوپر رتن کا کوٹ ٹنگا ہوا تھا..... درشی کے منہ پر ایک سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سوچا تمام مرد ایک ہی سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ یہی مردوں کا جوہر ہے اور پھر زنانے میں پٹی کوٹ یا جارجٹ کی ساڑی کے اوپر اپنا کوٹ شاید عمداً" بھول جانے کا کیا یہ مطلب نہیں کہ اس کوٹ کے ساتھ جیسا سلوک مناسب سمجھا جائے' کیا جائے۔ گویا کوٹ زبان حال سے کہہ رہا ہو۔ "میں نے تجھے مسل ڈالا ہے' تو اس کے عوض میں میری جیبیں کاٹ ڈال۔" درشی نے دروازے پر نظر گاڑے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں دس دس کے چار نوٹ اور کچھ ریزگاری آ گئی۔ اس نے سوچا اگر وہ اس میں سے ضرورت کے مطابق کچھ اڑا لے تو رتن کیا کہے گا..... لیکن..... چوری تو ایک ذلیل حرکت ہے..... ابھی تو روحوں کا ملاپ نہیں ہوا..... وہ یوں جیب میں سے پیسے اڑا کر بیسوا نہ کہلائے گی؟

دو تین دن تک درشی کو ہری پال پور' اپنے مربعوں سے بذریعہ تار سو روپے آ چکے تھے۔ شگن کے اور روپے اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے بہت حد تک درشی کی عصبی کمزوری کو آرام پہنچایا۔ گکو کی ماں بھی خوش تھی اور بھگوان کو کم یاد کرتی تھی۔ درشی نے کئی مرتبہ رتن کو کہا کہ بازار جا کر برساتی کوٹ خرید لینا چاہیے۔ برسات کے بعد اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ لیکن چند دنوں

سے رتن لال اپنے دفتر میں اسمبلی کے لئے ہندسے تیار کر رہا تھا اور اس کے لئے اسے بارش، دھوپ، ساڑی کسی چیز کی پروا نہ تھی اور اس بات نے درشی کو بہت غمگین کر دیا تھا۔

ایک شام رتن گھر واپس آیا تو درشی کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ اس کے ہاتھ میں جھومروں کی ایک جوڑی تھی۔ جو تھی بھی بہت ہلکی اور جدید فیشن کی۔ درشی خوش نہیں ہوئی کیونکہ وہ جھومر اس نے خود نہیں خریدے تھے۔ رتن نے انہیں اپنی خاطر خریدا تھا۔ وہ خود بھی تو اسے جھومر پہنے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد کبھی بھی عورت کی فرمائش پر زیور خریدنا پسند نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنے لئے سجانے کو خریدتے ہیں۔ درشی کو تسکین ہوئی بھی تو محض اسی لئے کہ رتن انہیں خودبخود خرید لایا اور ایسا کرنے میں اس نے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا۔

جھومروں کی جوڑی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ طنزیہ انداز سے بولی۔

"ختم ہو گئے آپ کے ہندسے؟"

"ختم ہو گئے۔"

رتن نے درشی کا ہاتھ پکڑا تو اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ بولی۔ "اب میرے ہندسے شروع ہیں۔ سردیاں آنے والی ہیں۔ کم سے کم تین بھتیجوں کے سویٹر بننے ہیں۔"

رتن نے پھر ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "تو کیا تمہیں جھومر پسند نہیں؟"

"جھومر؟..... اوہ! ہاں" درشی منہ پھلاتے ہوئے بولی۔ "آپ نے بہت تکلیف کی۔"

شیکوشا بدستور مسکرا رہا تھا۔ وہ محض ایک کلاک ہی نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹے متواتر ٹک ٹک، ٹک ٹک کرنے والا وہ درشی کا استاد بھی تھا۔ جس کے ڈائل اور سوئیوں نے درشی کو ایک اچھی لڑکی کے طور پر دیکھا تھا اور اب شاید ایک اچھی بیوی کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

رتن پہلی کڑی کھو دینے سے منزل مقصود پر نہ پہنچ سکا۔ وہ درشی کے باتوں میں طنز نہ پا سکا تو وہ بولی۔

"آپ تو یونہی میرے لئے پیسے برباد کرتے ہیں..... بھلا اور بھی کوئی ایسے کرتا ہے؟"

رتن پھٹی پھٹی آنکھوں سے درشی کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اگر درشی اسی وقت وہ جھومر اپنے کانوں میں نہ ڈال لیتی تو دنیا کی تاریخ کسی اور ہی ڈھب سے لکھی جاتی۔ اس نے نہ صرف جھومر پہنے بلکہ اپنی گردن کو عجب انداز سے ادھر ادھر ہلا دیا اور رتن ایک ایماندار آدمی کی طرح اس کی گردن اور اس کے ہلتے ہوئے جھومروں کے متعلق سوچنے لگا۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی تک درشی کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ بولی۔

"کیا لاگت آئی ہے اس پہ؟"

"کوئی بہت نہیں۔"

"تو بھی۔"

"ساڑھے اکتیس روپے"

درشی نے اپنے صابر کے بیگ کو ٹٹولنا شروع کیا۔ رتن ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک گیا۔ وہ شاید اس بات کو مذاق سمجھ کر جانے دیتا لیکن درشی کے چہرے نے اسے مذاق کی حدود سے بلند و بالا اٹھا دیا تھا..... کچھ دیر بعد رتن نے اندھیرے میں اپنے پاؤں تلے زمین محسوس کی۔ گویا کوئی کھوئی ہوئی کڑی اس کے ہاتھ آ گئی ہو۔ اس نے اپنی جیب میں سے تمام نقدی نکالی اور اندھیرے میں درشی کے قدموں پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تم اس دن اپنی کسی ضرورت کا ذکر کر رہی تھیں..... لو یہ اپنی مرضی سے خرچ کر لینا۔"

درشی نے ایک ثانیہ کے لیے سوچا۔ رتن نے ایسا کرنے میں عورت کو سب سے بڑی گالی دی ہے..... "بیسوا!"

بیاہ کو ایک دو سال گزر گئے۔ لیکن دونوں کی روحوں میں کوئی خاص بالیدگی نہیں آئی۔ بلکہ رتن اب کچھ کھچا کھچا سا رہنے لگا۔ اس عرصہ میں درشی بیوی کے تمام ہنر سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ حساس ویسے ہی تھی۔ آج تک اس نے کھلے بندوں رتن سے پیسے نہیں مانگے تھے۔ وہ بسا اوقات اپنی کمزوری پر اپنے آپ کو کوسا کرتی عموماً" یوں ہوتا کہ بچے کے فراک یا اسے کیلشیم دینے کا ذکر ہوتا تو وافر پیسے مل جاتے اور پھر رتن اس کی ضرورت اور اپنے شوق سے متاثر ہو کر خود بھی اسے کچھ نہ کچھ لا دیا کرتا۔ ہری پال پور میں آنا جانا بنا ہی ہوا تھا۔ اگرچہ درشی کی ماں سوتیلی تھی۔ باپ تو سوتیلا نہیں تھا۔ بڑا بھائی ایگزیکٹو انجینئر ہو چکا تھا اور پھر دفتر اور ہندسوں کے بعد رتن کا کوٹ اس کی پٹی کوٹ پر ٹنگا ہوتا.....

اس ایک دو برس کے عرصہ میں شیکوشا کا چہرے قدرے پیلا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ پہلی سی شرارت اور طنز آمیز مسکراہٹ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا کوئی پرزہ خراب ہو جاتا تو اس کی مرمت کر دی جاتی۔

ایک دن رتن لال شب کو کسی دوست کے ہاں ٹھہر گیا۔ صبح واپس آیا تو درشی سے

مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"آج صبح میں نے ایک واقعہ دیکھا۔"

درشی نے اپنے بچے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔ "کیا دیکھا ہے آپ نے؟"

رتن بولا۔ "میں کہتا ہوں..... یہ بازاری عورتیں کتنی بے حیا ہوتی ہیں۔ آج میں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا۔ جس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ جس کی آنکھیں خمار آلودہ تھیں۔ جسم سے بیمار دکھائی دیتی تھی۔ صبح صبح سر بازار اس نے ایک بابو کو کالر سے پکڑا ہوا تھا اور پیسے مانگ رہی تھی۔ وہ بابو بے چارہ کوئی بہت ہی شریف آدمی تھا۔ وہ چیختا تھا' چلّاتا تھا۔ کہتا تھا میں نے اسے ایک خوبصورت ساڑی لا کر دی ہے۔ گرگابی خرید دی ہے اور اب پیسے طلب کرتی ہے....."

وہ بے غیرت بھرے بازار میں کہہ رہی تھی کہ وہ تو سب حسن کی نیاز ہے اس نے اپنے لئے مجھے وہ ساڑی پہنوائی تھی۔ اپنے لئے گرگابی جسے پہن کر میں اس کے ساتھ لارنس باغ کی سیر کو گئی۔ لیکن مجھے پیسے چاہئیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے' مجھے اپنے بچے کے لئے کپڑے چاہئیں' میں نے کرایہ دینا ہے' مجھے پوڈر کی ضرورت ہے....."

اور اس کے بعد رتن ہنسنے لگا۔ بے معنی' بے مطلب ہنسی' اور اس عرصہ میں اپنا سلوٹوں سے بھرا ہوا کالر چھپاتا رہا۔ اس بات کو سن کر درشی کی ساری طبعی کمزوری واپس آ گئی۔ درشی نے محسوس کیا اس میں جتنی کمزوریاں تھیں۔ وہ بیسوا میں مفقود تھیں۔ وہ اس کے جسم کا بقیہ حصہ تھی جسے اپنے آپ میں محسوس کرتے ہوئے وہ ایک مکمل عورت ہو گئی تھی۔ درشی نے سر سے پاؤں تک شعلہ بنتے ہوئے کہا۔

"وہ بابو پاجی آدمی ہے..... کمینہ ہے..... اور وہ بیسوا کسی گرہستن سے کیا بری ہے؟"

رتن لال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے درشی کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا مطلب ہے..... اس جگہ اور اس جگہ میں کوئی فرق نہیں؟"

درشی نے اسی طرح بپھرے ہوئے کہا۔ "فرق کیوں نہیں..... یہاں بازار کی نسبت شور کم ہوتا ہے۔"

..... کلاک کی ٹک ٹک بند ہو گئی۔ رتن لال سوچنے لگا۔ "عورت سچ مچ ایک معمّا ہے اور شو نہار نے.....!"

رفوگر

دیوندر ستیارتھی

آسمان جیسے پھٹے پشمینے کا شامیانہ۔
نیل گگن پہ دودھیا میگھ' جیسے مدھوبن میں مست ہاتھی۔ ہندوستان کی قسم۔ کارواں سرائے سلامت یا الٰہی مٹ نہ جائے درد دل!
تر ہی والے سفید گھوڑے پر کالا شہسوار۔
تر ہی بجی..... پہلے دیو گیری بلاؤل پھر مالکوس
دوکان کی اونچی سیڑھیاں چڑھ کے آئی آئینہ خانم اور رفوگر سے بولی:
"پہلے میری شال رفو کیجئے۔ پیشگی مزدوری۔"
پانچ کا نوٹ دے کر وہ چلی گئی۔
جس کی چاہو سوگند لے لو۔ کوئی رائے قائم کرنی مشکل۔
دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔
برگد کی آنکھ میں ابابیل کا گھونسلا' جہاں سورج کی پہلی کرن داخل ہوتی۔
برگد تلے پگلی بھکارن بڑ بڑاتی۔
"کچھ نہ کہو لوگو' میرے علی کو کچھ نہ کہو۔"
کارواں سرائے اپنی خبر رکھتی ہے۔ محبوب کی سرگوشی ہو یا ماں کی لوری۔
جن کے قدموں کے نشان مٹ گئے' ہم ان کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔
رفوگر علی جو امام کی گنبد والی دوکان۔ اونچی سیڑھیاں' تین کھڑکیاں۔

دوستانہ جذبے سے چمکتی آنکھیں۔ جگ درشن کا میلہ۔ کون گرو کون چیلا۔
تری والا اپنی دھن الاپتا رہا۔
وہی کارواں سرائے، وہی بیگم بازار، وہی دوڑتی نظریں اور وہی گم ہوتی پرچھائیاں۔ سب کی توجہ کا مرکز علی لجو امام۔
یہ علی جو تو ہوا، یہ علی لجو امام کیا ہوا؟
پیر باورچی بھشتی خر
ہر فن مولا
کوئی اسے علی کہتا، کوئی امام۔ کوئی استاد
اسکے ہاتھ دعا کے لئے اوپر اٹھ گئے۔
یا پیر، دست گیر، روشن ضمیر!
سامنے دیوار پر کالا ریشم، سنہرے حروف، فاختی، چوکھٹے میں جڑا شاعر کا کلام
رسم الخط کو سلام:

ڈھوتے ڈھوتے پربت غم کا، پاؤں میں پڑ گئے چھالے
بین کرے دیوانی پچھوا، رو دیئے ماتم والے
انہونی کا چاک گریباں، کون رفو کر پائے
بول سپیرے! تم نے اب کے، کتنے پھنیئر پالے

بغل والی دیوار پر لال صوفی کے ساتھ رفوگر کی تصویر۔ دونوں کی ہنسی ہم آغوش۔ بیس برسوں پہلے کی یادگار۔
لال صوفی ہوتا تو یہیں سے شروع کرتا اپنا سفرنامہ۔
میخانوں کا عام رویہ، دھینگا مشتی تاتا تھیا۔
شدھی کا چمتکار
من کے آر پار
مزار گل شہید پر قوالی کی رات۔
آتے جاتے لوگ۔ کارواں سرائے خوش: محفل میں چہل پہل:
کہانی کا کیا کمال: سپتا نہیں اگیا بیتال۔

رفوگر کی ننھی منی نواسی جگنی اپنی گڑیا سے کھیلتے ہوئے گیت کا بول اچھالتی :

جاگ اری جنت کی گڑیا
جاگ اری جنت کی چڑیا
کھا لے یہ بچ میل مٹھائی
او ری گڑیا ! او ری چڑیا

لال صوفی ہوتا تو جگنی کے ساتھ سُر میں سُر ملا کر گاتا۔
پنا لال کی تان یہیں ٹوٹتی کہ سب کتے کاشی گئے تو ہنڈیا کس نے چاٹی!
لال صوفی کو اولاد احمد اور وارث معصوم کا سلام۔ اس کا ایک اور نام گل شہید۔
خلیل اور رحمان نے یہ کہہ کر دم لیا کہ لال صوفی تو جوانی میں بڑھاپے کا مزہ لیتا رہا۔
"۔اللہ میگھ دے رے اللہ میگھ دے!" گنگناتے ہوئے اولاد احمد رفوگر کی دوکان میں آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ چنچل سنگھ اور پنا لال کا وہی مذاق کہ آ رہی ہے چائے دار جلنگ سے آچار یہ مہادیو "۔دس آئے دس گئے!۔" کہتے ہوئے کتاب محل کی طرف چل دیئے۔
گل آئینہ خانم کی موڑ پر بوڑھا برگد' رفوگر کا پڑوسی۔ امیر خسرو کی کہہ مکرنی۔
استاد نے پوچھا "آپ کی عمر؟۔"
بولے "برگد سے پوچھ لو۔"
برگد کی داڑھی ہنسنے لگی۔ جیسے ہوا کہہ رہی ہو کہ بوڑھا برگد سب جانتا ہے۔
جگنی سے پوچھا "تمہاری عمر؟۔"
"۔میری گڑیا سے پوچھ لو۔" وہ ہنس پڑی۔
آگے چلتے ہیں' پیچھے کی خبر نہیں.....کعبہ میرے پیچھے ہے' کلیسا میرے آگے.....
جو سب سے پیچھے رہنا چاہتا ہے ' اسی کو سب سے آگے بڑھاتی ہے کارواں سرائے۔ ایک ہی داؤ میں پانسہ پلٹ سکتا ہو۔
وہ خود ستائی کبھی نہ کرتا۔ گاہک سے یہی کہتا "شاید میرا کام آپ کو پسند نہ آ سکے!۔"
اگر کسی کو اس کا کام پسند نہ آتا تو وہ جھگڑے میں پڑنے کی بجائے صاف صاف کہہ دیتا آپ کچھ بھی نہ دیجئے اور رفو کی ہوئی اپنی اچکن لیتے جایئے۔"
پنالال جگنی کو چڑیا کہہ کر چھیڑتا تو وہ کہتی:

۔"وہ چڑیا جاپان گئی !۔"

رفوگر کے ابا دست گیر کی موت پر چنچل سنگھ افسوس کرتے ہوئے کہتا:

"آگے مرنا پیچھے مرنا' پھر مرنے سے کیا ڈرنا!۔"

کسی کے ہاتھ میں کئی تہوں میں لپٹا ہوا کاغذ۔

کسی کی بات چاکلیٹ اور بسکٹ کے بیچ۔

کسی کی نظر ایک کونے میں پڑی جگنی کی لینگے والی گڑیا پر۔

پتھر کی دیوار پر رنگ برنگے پوسٹر:

"سچ کو سولی .....۔"

"آنکھ کا پانی مرگیا .....۔"

"ڈھائی دن کی بادشاہی.....۔"

"پاؤں میں سنیچر....."

"سفر نامہ ابن بطوطہ....۔"

"چوڑیاں پہن لو.....۔"

"سفید گھوڑے پر کالا شہسوار...."

امرت گیسٹ ہاؤس کے آگے مغل اعظم ہوٹل اور بیگم پل سے آگے ترکمان دروازہ۔

بھول بھلیاں اور بارہ دری کے بیچ کتاب محل۔

بک لینڈ پریس کی بغل میں لبرٹی کینٹین۔

کہیں اوپر کوٹ' کہیں نیچا نگر۔

کہیں اشاڈی لکس ہوٹل' کہیں مٹیا محل۔

کارواں سرائے کا نام بدل کر پانڈولپی رکھ دیا۔

یہ اور بات ہے کہ لوگوں کی زبان سے کارواں سرائے نہیں اترتی۔

واہ ری کارواں سرائے:

ندیا میں مچھلی جال

بھکارن پھٹے حال

نام بن پھول بائی۔

اس کی ہتھیلی پر پانچ پیسے کا سکہ رکھنا نہ بھولنا علی لجو امام اور ہتھیلی میں گدگدی ہونے لگتی۔

کل کی نرتکی آج کی بھکارن۔ سونے چاندی کے سکوں کی کھنک اس کے پاؤں چومتی تھی۔ پانچ پیسے کا سکہ لیتے وقت آج اس کی آنکھیں پاؤں کی طرف جھک جاتیں۔

کون سی داستان سنو گے؟ کچھ سنائیں گے' ذرا اور قریب آ جاؤ۔

دو نینوں کی ایک کہانی

ماں کی لوری ایک نشانی

جو گزرو گے ادھر سے' میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے

شکستہ ایک مسجد ہے' پرانا ایک مندر ہے۔

۔"عمر بھر کون محو رقص رہا؟۔" رفوگر نے رفو کرتے ہوئے پوچھا۔

نغمے کی سوغات۔ قوالی کی رات۔ صحیح گئے' سلامت آئے۔

شلا لیکھ کے روپ میں کس یگ کی رچنا آگے آئی؟

ننھی منی جگنی اور اس کی بڑی بہن نسیم۔

"تو نسیم کی بہن ہے جگنی؟ ۔" پنا لال نے پوچھا۔

"نہیں نسیم میری بہن ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

کہاں تک چپ رہیں! جب سر سے اوپر ہو گیا پانی!

آچاریہ مہادیو یہ کہتے ہوئے محل میں آئے کہ سو سنار کی' ایک لوہار کی:

"سونے سے مہنگی گھڑائی!" وارث معصوم نے تھاپ لگائی۔

"رام دہائی! رام دہائی!" سب کی ملی جلی آواز۔

"وہ اپنا دامن چھڑا کر چلی گئی۔ کام روپ کے پاس جا کر رکیں گے اس کے قدم۔" اولاد احمد نے کہا۔ اشارہ بن پھول بائی کی طرف۔ برات عاشقاں برشاخ آہو..... ہرن کے سینگ پر عاشقوں کی برات۔

کچھ اور پوچھئے' یہ حقیقت نہ پوچھئے!

پھولوں جیسے بازو' تھکن سے چور!

اپنی گڑیا کا بیاہ رچاتی' جگنی گاتی رہی:

دھوئیں دھوئیں ! تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

بن پھول کو دیکھ کر رفوگر بادشاہ بن جاتا۔ گویا اس کے ہاتھوں میں اشرفیاں کھنکنے لگتیں۔

تیس دن ، چالیس میلے
میلے میں سب لوگ اکیلے
ہم کہاں سب سے الگ؟

آج پرویئا چلی پچھوا کے بعد!
مرنے والے کی نہیں، جینے والے کی موت ہے!
اے روشنیٔ طبع تو برمن بلاشدی!
"میں تو بن پھول کو چترلیکھا سے کم نہیں مانا"۔ پنالال کا اعلان
وہ سوچتا ایک دن بن پھول سڑک پر چلتے چلتے ڈھیر ہو جائے گی اور اس کی ارتھی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بھیڑ کندھے بدلتی رہے گی۔
کارواں سرائے کا یہی احساس کہ علی جو امام جس کا بھی کام کرتا ہے، بڑی ایمانداری سے اور دن رات ایک کر کے۔
وہ تو گاہک کو ان داتا مانتا تھا۔
اس کی نظر پرندوں کے اسپتال پر، جس کا سنگ بنیاد لال صوفی نے رکھا تھا۔ چنچل سنگھ بات کو گھیر گھار کر لاہور تک لے آیا:
"لاہور شہر۔"
گربانی کا شبد ..... جانے کون سا اشارہ۔
"یہیں رہنا ہے، جب تک سوئی دھاگے کا ساتھ ہے۔" رفوگر کا اپنا انداز۔
"تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا!۔" اولاد احمد نے اپنی کتاب کا حوالہ دیا۔
"سو سال جئیں، سو سال دیکھیں۔" آچاریہ مہادیو کی تان یہیں ٹوٹتی کہ مندر میں دیوتا جاگے۔
چنچل سنگھ یہ کہہ کر دم لیتا کہ وہ پانی ملتان رہ گیا!
اولاد احمد کے زور قلم کا نتیجہ" ادھورا آدمی، آدھی کتاب۔"
پنا لال کا قد ..... سوا تین فٹ مگر اس کا یہی دعویٰ:
"میں لنکا سے آیا!۔"
جیسے وہ اپنے آپ کو باون گزا مانتا ہو۔
گلی آئینہ خانم کی شان..... نوگزے کی زیارت، سب پر مہربان۔
گڑیا سے باتیں کرتے کرتے جگنی بول اٹھی:

"اللہ اللہ لوریاں' دودھ بھری کٹوریاں!۔"

راگ راگنی ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔

"پاؤں تلے پرکھوں کی ہڈیاں۔" آچاریہ مہادیو گیان بگھارتے۔

سرکٹے دھڑ کو دفنا کر مزار گل شہید کا نام دیا گیا۔

لال صوفی کا ایک اور نام ..... گل شہید۔

اولاد احمد کی کتاب کا انتساب۔ گل شہید کے نام۔

"لوگوں کے دماغ بھی رفو ہونے چاہئیں!۔" رفوگر مسکرایا۔

آنکھ کی پتلی..... پتلی بائی!..... کارجہاں دراز ہے!

موتی جھیل غائب..... اب وہاں چتر لیکھا کالونی کی چہل پہل۔

گاندھی گارڈن..... کمپنی باغ کا نیا نام۔

کبھی آواز کا چہرہ' کبھی پہچان چہرے کی!

خوشبو سے کہو یہ کہ ہماری طرف آئے!

بھس میں آگ لگا کے جمالو دور کھڑی!

"کہیں بھی آگ لگے' بیچاری جمالو بدنام۔"

آسام سے آیا کام روپ' جسے بن پھول نے الکھ نرنجن مان لیا۔

پیروں میں گھنگھرو باندھے' وہ اس کے آگے ناچتی رہتی۔

پاگل بھکارن کی اور بات' جو سڑک پر کھڑی آنے جانے والوں کو دعائیں دیتی رہتی۔

کام روپ کو دیکھ کر آسام سامنے آجاتا۔

اوپر کوٹ..... سرگوشیاں ہی سرگوشیاں۔

بن پھول کے جوڑے پر گجرے کی خوشبو۔

گفتگو..... گل شہید کے مزار تک۔

علی جو امام یہ بتانا نہ بھولتا کہ وہ سورج اگنے سے پہلے ہی پیدا ہوا اور اسی روز اس کوٹھری میں ابابیل کا بچہ انڈے سے باہر نکلا۔

آچاریہ مہادیو جب کبھی "کشمیری بے پیری!۔" کہہ کر چھیڑتے تو رفوگر کہتا:

"مہاراج! میں تو آپ کو بھی بے پیر مانتا ہوں۔"

وقت کا احساس جیسے جنگلی کبوتر کی اڑان۔ اڑتا ہی جائے بس اڑتا ہی جائے!

دنگے فساد شروع ہو گئے تو کام روپ مارا جائے گا اور اسے الکھ نرنجن مان کر پیروں میں گھنگھرو باندھے اس کے آگے ناچنے والی بن پھول کی جھنکار بھی ختم ہو جائے گی۔

کبھی میوزک کانفرنس کبھی کتابوں کی نمائش کبھی آل انڈیا مشاعرہ۔

ہیرا لال کا بیٹا موتی لال اور موتی لال کا بیٹا پنا لال۔ تینوں بونے۔ مگر نفرت کے خلاف جہاد' ان کا ایمان: جیسے بسم اللہ خان کی شہنائی یا پنا لال کا بانسری وادن۔

پٹھان کا پوت..... کبھی اولیا' کبھی بھوت۔

مغل کی اور بات۔

اب کیا شاہانہ آن بان!

تاتاری کا قصہ ختم!

لال صوفی..... تاتاری سوداگر کے خاندان کی آخری کڑی۔

"برف کے پھول سے اٹھتا ہے دھواں دیر تلک!۔"

رفوگر رفو کرتے کرتے گنگناتا رہا۔

اتہاس گوسوامی کا نام آتے ہی' مس فوک لور اور گل ہما کا نام آئے بغیر نہ رہتا۔

گل ہما یعنی برف کا پھول۔

اتہاس گوسوامی کی" ۔نیل یکشنی ۔"میں لال صوفی کو شردھانجلی دی گئی۔

بہار آئی ہے جوبن پر ابھار آیا۔

پیچھے رہ گیا بھٹیاری کا رنگ محل۔

ناک کے سیدھ چلے جاؤ تو کتاب محل کا ریڈنگ روم۔

کبھی گرمی کا رونا کہ چیل انڈا چھوڑے!

کبھی کڑاکے کی ٹھنڈ کہ بلبلیں مر گئیں اکڑ کے تمام!

(۲)

ایک روز اچاریہ مہادیو بس پر سوار ہونے سے پہلے نیند کی چودہ گولیاں کھا گئے اور بس سے اتر کر کارواں سرائے کے بارہ ٹوٹی چوک میں نیلا گنبد کے فٹ پاتھ پر گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔

کسی نے ٹیگور اسپتال کو فون کر دیا۔ اسپتال کی وین آئی اور اچاریہ مہادیو کو لے گئی۔
وہاں انہیں مردہ سمجھ کر مردہ گھر میں بھیج دیا گیا۔
اگلے روز ان کا پوسٹ مارٹم ہونا تھا۔
صبح چار بجے آچاریہ مہادیو کو ہوش آیا تو اس کے ساتھ کئی مردے۔
اپنے آپ کو مردہ گھر میں پا کر ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا سکے۔
دروازہ کھلا تھا۔
وہ سرکتے سرکتے باہر اندھیرے میں جا پہنچے اور پہرے داروں سے بچتے بچاتے اسپتال کے احاطے سے باہر۔
کئی گھنٹے تک یہی احساس رہا کہ موت دبے پاؤں ان کا پیچھا کر رہی ہے۔
یہی خدشہ لگا رہا کہ کہیں سرکار اقدام خود کشی کے الزام میں نہ دھر پکڑے۔
پرانے دوستوں میں سے ' جس سے بھی ملے' وہی انہیں بھوت سمجھ کر سہم گیا۔
علی جو امام نے اولاد احمد اور وارث معصوم کو ساتھ لے ٹیگور اسپتال سے پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ بارہ ٹوٹی چوک کے فٹ پاتھ سے لائی گئی لاوارث لاش کو سرکاری خرچ پر جلا دیا گیا۔
جب آچاریہ مہادیو اچانک بک لینڈ پریس کے پروف ریڈر پنا لال کے سامنے آئے تو وہ انہیں بھوت سمجھ کر اتنا خوفزدہ ہوا کہ تین دن تک اسپتال میں رہنا پڑا۔
"میں بیراگی بھیا انوراگی ..... ۔" جانے کس کس بات پر زور دیتے رہے آچاریہ مہادیو۔
چاند تاروں کے تلے' کون سا قصہ چلے!
ہماری پہچان ..... رفوگر کی دوکان۔
بھاری ڈیل ڈول' لمبی داڑھی' بڑی بڑی آنکھیں' آنکھوں پر چشمہ۔ ہاتھ میں سوئی دھاگا۔
سگریٹ جلانے کے لئے ماچس نہیں' لائٹر..... گل ہما کی سوغات۔
"لونگ لو مس فوک لور ! اور گل ہما زندہ باد !۔"
اولاد احمد نے تھاپ لگائی :
"کبھی تو ہنسائے' کبھی رلائے .....زندگی کیسی ہے پہیلی ہائے....۔"
"ہم تو ہر آدمی کو اپنے سے آگے مانتے ہیں۔ اس کا پیار ہمیں ملے نہ ملے۔ وارث معصوم نے جیسے اندھیرے میں روشنی کی پگڈنڈی پر اتہاس گوسوامی کو چلتے دیکھا۔ دائیں مس فوک

لور ' بائیں گل ہما۔

اب کیا ہو گا' کسے خبر! لوک یان کے لئے جینا اور مرنا اتہاس گوسوامی کا دھرم ایمان۔

"پیار کر کے بھلانا نہ آیا ہمیں ...." رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔

کتاب محل بڑھیا لائبریری ہے جیسے کسی مفلس نے پرانے خزانے کا پتہ چلایا۔

"یہ کون سی پستک تھی' جو تم پڑھ رہے تھے۔" ۔ پنالال نے چنچل سنگھ سے پوچھا۔

جتنی پرچھائیاں ' اتنی سیڑھیاں ..... ساتھ صدیوں پرانا ہے اپنا!

"دکھیا کیوں اتنا سنسار!" ۔ نظم بن پھول کا۔

اٹ پٹا سا بول "پگلا کہیں کا!۔"

اپنے دھاگے' سدا آگے۔ کہیں خیر مقدم کہیں الوداع

سونی ڈگر ہو یا ہو میلہ۔ تشریف لائیے حضور!

"رفوگر کے لئے ضروری ہے کہ کپڑے میں جان ہو۔" رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔

"اب تو اپنے آپ پر آئے نہ وشواس۔" چنچل سنگھ بول اٹھا۔

بال بچے دار پنا لال نئی دلہن بیاہ لایا۔

دلہن نے اسے نیا خطاب دے ڈالا:

"چیونٹیوں بھرا کباب!۔"

گفتگو ہوتی رہی گھنٹوں۔

چنچل سنگھ کو یہی بات ناگوار گزرتی کہ کوئی اسے ہوٹل مہاراجہ سمجھ کر ہی اس کا احترام کرے۔

ہم کتنا ٹوٹ کے روئے جب لال صوفی کا دھڑ ملا' سرغائب۔

وارث معصوم گنگاتا رہا:

قصیدے سے نہ چلتا ہے ' نہ یہ دوہے سے چلتا ہے
حکومت کا ہے جتنا کام ' سب لوہے سے چلتا ہے

وہ کون تھا' جو مسکا کے پاس سے گزر گیا؟

آچاریہ مہادیو نے جوگی بننے کا سپنا دیکھا۔

یوگ آشرم سے لگاؤ۔

شادی سے دور۔
اس ہیبی کا ناش ہو' جس کی دوستی کے کارن انہیں مینڈکس کی لت پڑ گئی۔ مٹی میں مل گیا یوگ کا سپنا۔ ہاتھ میں اخبار کا سنڈے ایڈیشن۔

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں
قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

اب کس بات کا پردہ' جب نغمہ گونج اٹھا؟
"بارہ دری۔" نے سدھارتھ سینما میں گولڈن جوبلی منائی۔
رفوگر کو کیا چاہیے؟ چاک گریباں یا پھٹا ہوا دامن۔
بلبلیں مرتی ہیں اپنی بات پر!
لال صوفی کے مزار پر پھول چڑھا کر چنچل سنگھ نے دعا مانگی۔
دولت خان کی دولت کا کرشمہ کہئے یا جادو' جو سر چڑھ کے بولا۔
وہ تین بار لوک سبھا کا ممبر چنا گیا۔
یہ تہذیب کس نے سکھائی ہمیں؟
کون سے رسم الخط میں لکھتا رہا وارث معصوم ؟
کالج کی کتاب پر جگنی کا اتنا ہی اعتماد' جتنا کہ گڑیا کے کھیل پر۔
دھک دھک دھک دل کی ڈفلی
ڈم ڈم ڈم ڈم ڈمرو باجے!
واہ رے آگیا بیتال!
سامنے اس موڑ پر پرندوں کا اسپتال
محرابوں سے چھن کر آئی دھوپ۔
سو کے قریب پرندے ہر ہفتے علاج کے لئے آتے۔ آشیاں سے دور ' بڑھیا علاج۔

(۳)

کارواں سرائے گل ہما کی طرح اپنی ہی بانہوں میں سمٹ جاتی اور کبھی نفرت کی آندھی پر جھنجلائی

سی لگتی۔
پنا لال استاد کے لئے چلم بھر لاتا۔
سوالوں کی راتیں، جوابوں کے دن۔
جب آچاریہ مہادیو اخبار پڑھ کر سناتے تو پنا لال اور اولاد احمد انہیں مذاق کا نشانہ بنانا نہ بھولتے۔
ٹیگور اسپتال میں ایک بار انہیں لاوارث لاش مان لیا تھا۔
دنگے فساد کی خبریں سنتے سنتے کبھی رفوگر کی سوئی سے دھاگا نکل جاتا، کبھی سوئی ہاتھ میں چبھ جاتی اور خون کی بوند چھلک جاتی۔
بادلو! او بادلو! او بادلو
مرگیا طوطا ہمارا مرگیا!
علی جو امام کو پسند کرنے والوں کے ڈھیر سارے نام
"دیکھ مجھے جھوم گیا ندیا کا درپن!۔" بن پھول کا نغمہ۔
جانے کون کون سی یاد محفل کا دامن تھامتی رہی۔
چائے آئی اولاد احمد نے تھاپ لگائی:

چائے آئی چائے آئی
دگنے بھاؤ کی چائے آئی

آچاریہ مہادیو نے لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور کش لے کر گنگناتے رہے:
"دوری نہ رہے کوئی، آج اتنے قریب آؤ!"۔
"چاندنی جب مل گئی، ہم چاندنی سو لئے ....." وارث معصوم کی تان۔
قصہ پنا لال کا۔
رفو کرتے کرتے علی جو امام کو جانے کیا خیال آیا کہ اٹھ کر چلے گئے۔
جانے سے پہلے جیب سے نکال کر پچاس کا نوٹ چوکی پر رکھ دیا۔ شیشے کے پیپر ویٹ کے نیچے۔
اتنے میں پنا لال آیا اور چپکے سے نوٹ اٹھا کر نو دو گیارہ۔
اولاد احمد نے اسے نوٹ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔
رفوگر واپس آیا تو اولاد احمد نے پنا لال کی شکایت کی۔
"وہ نوٹ تو اسی کے لئے تھا۔" رفوگر مسکرایا۔

رحمان یہ خبر لایا کہ دولت خان نے کام روپ اور بن پھول کے لئے دونوں وقت کھانے کا انتظام کر دیا سماوار ریستوران میں۔

"ووٹ حاصل کرنے کا نیا ہتھکنڈا" ۔ وارث معصوم ہنس پڑا۔

"آج قصے کو پھپھوندی لگ گئی!...." ۔اولاد احمد گنگناتے رہے۔

(۴)

قاتل بڑا بے رحم تھا' جو لال صوفی کا سر کاٹ کر لے گیا اور دھڑ جھاڑیوں میں چھپا گیا۔

سوال پوچھو'جواب دیں گے۔

"قتل ناحق صوفی معصوم کا!" اولاد احمد کی تھاپ۔

ذرا سی بھول یہ رنگ لائی۔

اب کہاں وہ کتھا گھاٹ!

پرندوں کا اسپتال.... کارواں سرائے کی شان

اسپتال کی نئی عمارت پر دولت خان نے دولت نچھاور کی۔

سدھارتھ سینما کا مالک..... دولت خان۔ بک لینڈ پریس کا بھی وہی پروپرائٹر۔

سینما.... بیوی کے نام

پریس..... چھوٹے بھائی کے نام

اصل بنیاد تو عقیدت ہے ..... یہی ایمان کی حقیقت ہے۔

سدھارتھ سینما میں نئی فلم "لوگ کہتے ہیں"

مر گئے' کھو گئے' جاتے رہے۔

اللہ اللہ لوریاں ..... دودھ بھری کٹوریاں..

رشوت کا ایک نام..... چاندی کی لگام۔

کارواں سرائے پر علی جو امام کی چھاپ۔ اس کی دوکان کارواں سرائے کی پہچان

(۵)

پگلی بھکارن سوکھے پیڑ کے تنے پر پانی ڈالتی رہی۔
پیڑ پر نئے پتے آ گئے۔
خواب میں ہم اپنے ہی جنازے کے ساتھ چلتے رہے۔
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!
پنا لال کے دماغ پر سوار ..... بن پھول ۔
وہ مدھومتی کے کنارے موجود رہتا' جب بن پھول مدھومتی سے نہا کر نکلتی۔

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا' ٹوٹ کے برسا پانی

"میں نے پیروں میں گھنگھرو باندھے' جتنے کہو اتنے گھنگھرو بولیں۔" ناچنا شروع کرنے سے پہلے بن پھول کا اپنے الکھ نرنجن سے یہی نویدن۔
دولت خاں۔ چوتھی بار لوک سبھا کا انتخاب جیت گیا۔
علی جو امام کی اور بات۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کا احترام
ہو مبارک او علی جو او امام

سکھ دکھ رہتے جس میں مل کر' جھلمل بستی اس کا نام۔
لال صوفی کا سرکاٹ کر لے گیا ہتھیارا!
آج تک اس کا پتہ نہ چل پایا۔
پرندوں کا اسپتال ..... اس کی سچی یادگار۔ وہ جب تک زندہ رہا' پرندوں پر جان چھڑکتا رہا۔
مارا گیا لال صوفی..... جو نفرت کو اپنے خون سے تولتا رہا۔
مزار میں دفن ..... سرکٹا لال صوفی۔
لوگوں کا گل شہید' جو زندگی بھر نفرت کے خلاف لڑتا رہا۔
لال صوفی کا مرثیہ.....اولاد احمد کی کتاب کا حرف آخر

بانس کے پتے پر یہ شبنم ماتم والے بولے کم کم
آنکھوں سے پلکوں کی باتیں پتھر ڈھو ڈھو روتے رہے ہم
آنسو کی کیا آب و تاب کیسے پڑھتے رہے کتاب
یہ زندہ اور مردہ لوگ آنسو میں موتی کی آب
کیسا پلٹا ہے یہ موسم دم توڑے پتوں پر شبنم
وہی سوال اور وہی جواب کہاں گیا وہ اپنا ہمدم

کھنڈر کے پیچھے چاندنی رات میں چمبیلی کے منڈوے تلے سو رہی تھی بن پھول۔
اسے ناگ نے ڈس لیا۔
اس کی ارتھی کے ساتھ علی جو امام دوکان سے شمشان تک چونیاں اور اٹھنیاں نچھاور کرتا رہا۔
اب کہاں بن پھول کی جھنکار!
اولاد احمد کی زبان پر جاپان کا ایک ہائیکو:
بس ایک تتلی ..... ننھی جان
مندر کے گھڑیال پر
بے خبر سوتی رہی!
کارواں سرائے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
بن پھول کے الکھ نرنجن کام روپ کی آتما بھی پنجرا خالی کر گئی۔
کارواں سرائے ارتھی کے ساتھ ساتھ۔
چھتیس گڑھ کے چودھری بھی شامل ہوئے۔
"رام رام ست ہے" کے ساتھ "اللہ ہو" کی آواز بھی بلند ہوتی رہی۔
چنچل سنگھ نے چندن کی چتا سجائی۔
آچاریہ مہادیو نے چتا کو آگ دکھائی
تیرہ دن تک کارواں سرائے کام روپ کا سوگ مناتی رہی..... چولہے آگ نہ گھڑے پانی۔
بچوں کا شور:

دھوئیں دھوئیں تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

(۶)

آج مزار گل شہید پر قوالی کی رات۔
اپنا لال صوفی ..... کارواں سرائے کا گل شہید
یادرہے گا اس کا نغمہ:

وہ ہندو ہوں کہ مسلم ایک ہی مٹی کے برتن ہیں
کوئی ہیں شیخ جی ان میں' کوئی ان میں برہمن ہیں

دائیں رحمان اور خلیل' بائیں اولاد احمد اور وارث معصوم۔
بیچ میں آچاریہ مہادیو۔
چپ کیوں ہو گئے؟ جواب دو۔
علی جو امام کیوں نہ آیا ہمارے ساتھ؟
رفوگر کی دوکان سے چل کر وہ بیگم پل سے گذرے۔ دائیں کھچڑی پور' بائیں چتر لیکھا کالونی۔
بارہ دری سے ہو کر عید گاہ مارگ پر چلتے چلتے کتاب محل کو پیچھے چھوڑا۔
جھلمل بستی سے آگے مزار گل شہید۔
شیطان طوفان' اللہ نگہبان۔ ہم قربان!
ان کا یہی احساس کہ یہاں نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ نہ راجہ نہ بھکاری' نہ رانی اور داسی کے بیچ کوئی دیوار!
جہاں ڈر' وہیں ہمارا گھر!
اب وہ زمانہ کہاں کہ سونا اچھالتے جاؤ۔
اولاد احمد کی یہی شکایت کہ اتہاس گوسوامی تشریف نہ لائے۔
جھوٹی قسم کون کھائے:
وارث معصوم کہہ رہا تھا کہ گل ہما اور مس فوک لور ہی چلی آتیں۔
آچاریہ مہادیو بولے:
"اگر مس فوک لور کو بھی فرصت نہ تھی تو گل ہما ہی چلی آتی۔"
ہر طرف جنگل نظر آنے لگا

وصل ہو یا وصال ہو یا رب!
ہم قربان!
سات قرآن درمیان!
سب نے نہا کر کپڑے بدلے!
قوالی کی رات!
سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی پہلی منزل ہے۔
اس وقت کی گردش یاد کرو' جب ساز ملائے جاتے ہیں!
وارث معصوم اور اولاد احمد یہ دیکھ کر جھوم اٹھے کہ اتہاس گوسوامی پہلے سے محفل میں موجود ہیں۔
مٹی میں گلاب کی سگندھ۔
آچاریہ مہادیو نے ہاتھ جوڑ کر اتہاس گوسوامی کو پرنام کیا۔
جانے کون سی ان بوجھی پہیلی بوجھی جا رہی تھی۔

اپنے تو ہیں سو سو یار
دھنئے' بنکر اور منہار
دل کی دنیا بہت اندھیری
اندھیارے میں کاروبار

اچانک درگاہ کے اندر ایک آدمی آ کر چلایا:
"فساد شروع ہو گیا!"
بکھرے بال' کندھے گھائل' سرلہولہان۔
چیختے چلاتے وہ گر پڑا۔
قوالی کی محفل درہم برہم۔
اب کیا ہو گا؟
خلیل اور رحمان کا کہیں پتہ نہ تھا۔
اولاد احمد اور وارث معصوم بولے:
"چلو آچاریہ مہادیو! اب بھاگ چلیں۔"
وہ چلتے رہے' گرتے پڑتے چلتے رہے۔

افراتفری، وحشت غم کا پہاڑ۔
بلند عمارتیں آگ کی نذر۔
گلیاں لہو لہان۔
کالی سڑکیں سرخ ہو گئیں۔
راہیں لاشوں سے پٹ گئیں۔
اپنی ہی دوکان کی سیڑھیوں پر مارا گیا علی جو امام۔
سفید گھوڑے کا کالا شہسوار
اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے.... گھوڑے کی ایال پر!
آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے، گرتے رہے!
مارا گیا علی جو امام:
ایک ہاتھ میں سوئی، دوسرے میں دھاگا!.....

کالو بھنگی

کرشن چندر

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے

"چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟..... کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے؟"

"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟"

"ساٹھ اور دو باسٹھ"

"مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے۔"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی

نہیں چاہتا۔ دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں لئے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری وریدیں لئے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔ اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرکے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے اس کی چار دیواری میں دیئے جلا کر چلے گئے لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے۔ اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے، اسے روتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر نہج سے، ہر منزل میں دیکھا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے سے موت تک، اس نے ہر اجنبی کو اس کے گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے، حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں، لیکن آج یہ بھوت ایسے نہیں مانے گا نہیں، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا، اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا، ڈسپنسری میں فنائل چھڑکتا تھا پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر

صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لئے جنگل لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی انہیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا۔ بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا.... ہر روز' بلاناغہ.... اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے اور آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درحالیکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لئے اس کے متعلق اتنی سر دردی مول لی جائے۔ مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ خواہش ہے' ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے' ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو' کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو' کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو' ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا۔ اس وقت بھی یہ وہیں تھا جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صُمٌ بُکمٌ مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ لِلّٰہ اس کی بے کیف' بے رنگ' پھیکی' میٹھی کہانی بھی سن لیجئے تاکہ یہ یہاں سے دور دفعان ہو جائے اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جاسکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباؤاجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح' اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی' اس نے

کبھی عشق نہ کیا تھا' اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے' سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈھ پر اکڑوں بیٹھا ہے اور ایک گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار' اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا' میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں' پھولوں کے تازہ ترین غنچے' کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت' ایسا حسن' ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی' اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی' اسے گویا سہلاتی ہوئی کسر کسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا' وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا' دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی' حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے' عورت سے بھی بڑھ کے لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی' چارہ کھلائے تو کالو بھنگی' جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی..... اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی۔ وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں۔ جنگل میں' راستے میں وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن

پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے۔ گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی، کبھی غرا کر کبھی کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے، پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا منا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے کیونکہ بے چارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لئے سوزن کاری میں مصروف ہے یا کالو بھنگی کا سویٹر بن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا، جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر و تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چیچڑیاں دور کرتا۔ اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے کل کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا لیکن یہ کتا بڑا خودغرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لئے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی، اور بڑی دلچسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں

اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آ جاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا کہیں کوئی نیولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، رستگھ، گٹاری، لال چڑا، سبزہ محی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ رابل سنکرا تائن سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا اور خوشبو بھی ایسی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا۔ ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے، مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے، بے ذائقہ اور معمولی سے بھٹے ہوتے تھے وہ کہ انہیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جاسکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انہیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے میں جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آ رہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فاؤنٹین پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

"کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟"

"کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی، نئی"

"نہیں چھوٹے صاحب۔" (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلئے، ممکن

ہے۔۔۔۔!)

"اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟" ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں"..... وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے' پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے..... "چار روپے کا آٹا لاتا ہوں..... ایک روپے کا نمک' ایک روپے کا تمباکو' آٹھ آنے کی چائے' چار آنے کا گڑ' چار آنے کا مصالحہ کتنے روپے ہو گئے' چھوٹے صاحب؟"

"سات روپے"

"ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنیے کو دیتا ہوں' اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر' لیکن دو جوڑے تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب' کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آ جائے!"

"وہ کیسے؟"

"گھی لاؤں گا ایک روپے کا' اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے۔"

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی' جب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کرکے کانپنے لگتے اس وقت بھی کہیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

"کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟"

"نہیں چھوٹے صاحب۔"

"کیوں؟"

"اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے!" (لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

"تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟" میں نے دوبارہ کوشش کرکے کچھ کریدنا چاہا۔

"کیا صاحب؟"

"عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی۔"

"عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ۔"

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ۔ بڑے لوگ بھی شادی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب، مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتا دی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتایئے؟"..... (ہم کیا بتائیں خاک)

"تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟"

"کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب۔"

میں نے ہار کر، اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مرگیا۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا اور ایک چپڑاسی اس کے لئے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود ٹھیک کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا اور جب وہ مرگیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے، اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہو گئی۔ کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کئے، مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراہِ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

"ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے۔"

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی' اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا' وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں اب بھی یہیں کھڑے ہو' پریشان کر رہے ہو' لِلّٰہ چلے جاؤ' کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟ کوئی بھول ہو گئی ہے۔ تمہارا نام۔ کالو بھنگی۔ کام۔ بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے' شادی نہیں کی' عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا' معجزہ نہیں ہوا جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے' اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے' غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں' اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے' چار روپے کا آٹا' ایک روپے کا نمک' ایک روپے کا تمباکو' آٹھ آنے کی چائے' چار آنے کا گڑ' چار آنے کا مصالحہ' سات روپے' ایک روپیہ بنیئے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے' مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو' ہسپتال میں کمپونڈر ہے بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے جنہوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کرلیا۔ وہ جوان ہے۔ اس کے چہرے پر رنگت ہے یہ جوانی' یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیض پر کلف لگا سکتا ہے۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے' ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہو گا۔ نوراں نھیا سے آئی تھی' سولہ سترہ برس کی الڑ جوانی' چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آ جاتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دو جوانوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آ جاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ بالکل واضح قاطع' یقینی امر سمجھتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ عشق بڑا متذبذب' غیر یقینی' گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے' اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی' گرگٹی' ہنگامی کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لئے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔

اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لئے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی' اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بیتاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے

پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو' چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو' اور کشتی ڈولنے لگے' ہولے ہولے ڈولتی جائے اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے' اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں' اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھر سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں' اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں' اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے..... پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی' اور وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکتی تھی..... نمبردار کا بیٹا' پٹواری کا بیٹا' پٹواری کا بیٹا' نمبردار کا بیٹا' وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی' دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی' دونوں پر مرمٹی تھی' نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انہیں اپنی بیوقوفی پر بڑا غصہ آیا اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آگئے' اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی' اور نوراں کے پاؤں پر زخم آگئے مگر وہ بچ گئی کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں..... خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں' بیگماں سے پہلے ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے اور خاوند تھے اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہش کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا مجبور ہو کے رہ جاتا۔ اس نے بیگماں سے عشق کیا' ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا' ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا۔ بہترین دوائیں' بہترین غذائیں' بہترین تیمارداری' لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے

چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو اس نے چلتے وقت خلجی کے دیئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے' اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت' اسی خلوص' اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا لیکن خلجی کے لئے نہ ریشماں رکی' نہ بیگماں' نہ جانکی اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں نوراں کی حالت غیر تھی۔ اس کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی ان تھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی' سڑاند دور ہوتی گئی' سوجن غائب ہوتی گئی' نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آگئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر' اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے اس سے معافی مانگنے کے لئے' اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لئے ہسپتال آئے تھے' اور نوراں انہیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی' کانپنے لگتی' مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تک وہ لوگ چلے نہ جاتے' اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا' اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے' اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی اور دونوں خر دماغ لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کئے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی..... سارا گاؤں اسے لینے کے لئے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم' اور سینکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے' خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار

سے اٹی رہ گذر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی' خلجی جو مڈل پاس تھا' بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا' پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا' جو محبت کرتا تھا' جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا' جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پرکیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو کمی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔ کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا' تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا' اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی' سب کچھ تو کہہ دیا' جو کچھ کہنا تھا' جو کچھ تم کہہ رہے ہو' تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی' تم مڈل پاس یا فیل ہوتے' تمہیں وراثت میں کچھ کلچر' تہذیب' کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے میں' میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا' ایک روپے کا نمک' ایک روپے کا تمباکو' آٹھ آنے کی چائے' چار آنے کا گڑ' چار آنے کا مصالحہ' سات روپے اور ایک روپیہ بنیئے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی' تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ' دیکھو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپڑاسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بخت یار چپڑاسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیڑ کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے' جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کرم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الین اور کدو جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مرجاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔ بخت یار کے تین بچے ہیں' اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے' ایک دفعہ بخت یار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی' اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا' اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے' اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جو اب اپنے کئے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے' پھر بارش شروع ہو گئی پھر کریڑی پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی' اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیئے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو' برف کے گالے زمین پر گرتے گئے' ساکن' خاموش' بے آواز' سپید مخمل گھاٹیوں' وادیوں' چوٹیوں پر پھیل گئی۔

"اماں....." بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

"اماں....." بخت یار چلایا۔

"اماں....." کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہو گیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا..... "میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہو گی' تمہارے ماموں کے پاس۔"

نکر کے دو کوس ادھر انہیں بخت یار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی گرتی' پڑتی' لڑھکتی' تھمتی' ہانپتی' کانپتی' آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے مزاحمت کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے۔ بخت یار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چلا تھا اور انہیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں' چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے' مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کریدنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے۔ خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ' بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے۔ تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی۔ میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں' سن' تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کے ان سے غلاظت صاف کرے' ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے' تو چاہتا ہے تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری رانوں میں طاقت اور سختی آ جائے' تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں' تیرے کمزور سینے کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے بادل غائب ہو جائیں' تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے انہیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے' تیرے گالوں میں لہو بھر دے' تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے' تجھے ایک مصفا لباس دیدے' تیرے اردگرد ایک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کر دے' حسین' مصفا' پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے' تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں' جو کچھ تو چاہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں' تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان

آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت و شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے' تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے' جو ابھی نہیں آیا' جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے' اس کا منہ چوما ہے' اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں گھمایا ہے۔ دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا..... یہ ہے میرا بیٹا' اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں' ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ' سات' آٹھ..... آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں' میں اک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔ اس کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کے لئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دوکاندار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی' لاکھوں' کروڑوں' اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں' کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے' یہ کام نہ ہوگا' اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھو لے' اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آ جائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے۔

پھول توڑنا منع ہے

کرتار سنگھ دُگل

اس روز جب میں بس میں سوار ہوا تو میں نے دیکھا' ایک سیٹ خالی تھی۔ یوں وہ سیٹ خالی ہی تھی لیکن اس کے خاصے حصے پر اس سواری کا قبضہ تھا' جو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

میں اس خالی سیٹ کے پاس پہنچ کر ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکی نے اپنی تراشیدہ بھوؤں تلے سے آہستہ سے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس نے پل بھر کے لئے مجھے دیکھا اور پھر پلکیں نیچی کر لیں لیکن میری سیٹ کے کافی حصہ پر اسی طرح قبضہ جمائے رکھا۔

آخر' سیٹ پر جو تھوڑی بہت جگہ خالی تھی میں اس پر بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو وہاں ٹکایا۔

میں بہت سنبھل کر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں دوسری طرف کھڑے ہونے والی جگہ کی طرف کر لیں۔ بس کے ہر جھٹکے اور ہر موڑ پر میں اپنے آپ کو اس طرح سکیڑ کے قابو میں رکھتا کہ کہیں میرے ساتھ بیٹھی ہوئی اس نوجوان سواری کیساتھ کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔

اگلے اسٹاپ پر جب بس سواریوں کے لئے کھڑی ہوئی تو فوجی سپاہیوں کا ایک ریلہ بس میں سوار ہو گیا۔ انہوں نے کھڑے ہونے والی ساری جگہ بھر دی۔ بس میں اس قدر بھیڑ بھڑکا ہو گیا کہ مجبوراً" اپنی ٹانگیں مجھے اندر کر کے اپنی سیٹ کے سامنے کی طرف کر لینا پڑیں۔ اس طرح کرنے سے پہلے میں نے ایک نظر اس نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا لیکن اس نے جتنی

جگہ میری سیٹ کی گھیر رکھی تھی اس پر اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

اپنی دونوں ٹانگیں سیٹ کے سامنے کی جانب کر لینے کی وجہ سے میرا ایک طرف کا سارا جسم اس حسین مسافر کے جسم سے لگنا شروع ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو انتہائی طور پر سکیڑ لیا لیکن اس کے باوجود میرا بازو اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

میرا بازو اس کے بازو سے مسلسل چھو رہا تھا اور وہ لڑکی اسی طرح اپنی سیٹ سے زیادہ جگہ پر قبضہ جمائے ہوئے بے پروائی سے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا کوٹ اسی طرح پھیلا ہوا تھا اس کی شلوار کے پائنچے اسی طرح جگہ گھیرے ہوئے تھے۔ اس کے جوڑے میں ٹنکی ہوئی ادھ کھلی سنہری کلی ویسی کی ویسی ۔ مجھے یوں لگ رہی تھی جیسے اڑ اڑ کر مجھے جھانک رہی ہو۔

بس چل پڑی۔

جب بس چلی تو ایک جھٹکے کے ساتھ میرا جسم میری اس نوجوان مسافر کے جسم سے چھو گیا۔ میں نے پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ لیکن میرا بازو اب بھی مسلسل اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بازو کا وہ حصہ جو ساتھ والے بازو سے چھو رہا تھا گرم ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے ایسے احساس ہوا جیسے میرے بازو کا وہ حصہ جو ساتھ والے بازو سے چھو رہا تھا وہ دہک کر انگارہ بن گیا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد مجھے ایسے لگا جیسے میرے بازو کے اس حصہ کا لہو ساتھ والے بازو سے نسوں اور رگوں میں آ جا رہا ہے ۔

مجھے ایک جھرجھری سی آ گئی اور میری آنکھیں جیسے نشے میں بند ہو گئیں مگر پھر ایک پل کے پل میں' میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ بس چلی جا رہی تھی۔

میرے دائیں طرف کھڑے ہونے والے فوجی سپاہی ایک دیوار کی دیوار بنے کھڑے تھے بس سواریوں سے بری طرح بھری ہوئی تھی تازہ ہوا کے لئے مجھے بائیں طرف بار بار کھڑکی کی طرف دیکھنا پڑتا تھا اور میرے بائیں طرف ہی میری وہ نوجوان مسافر بیٹھی ہوئی تھی۔ خاموش' بے حس و حرکت' ایک بت کی طرح۔

"یہ لڑکی کسی فوجی افسر کی بیوی معلوم ہوتی ہے۔"

کچھ دیر بعد میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

"صدر بازار سے بس میں سوار ہوئی ہو گی۔ صبح ہی صبح گھر کا سودا سلف خریدنے کے لئے دہلی جا رہی ہے ۔ گھریلو ضروریات کی چیزیں تو اس کا شوہر لاتا ہو گا۔ یہ تو صبح کے وقت یوں بن

سنور کے اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے جا رہی ہو گی۔ یا پھر اس کی لپ اسٹک ختم ہو گئی ہو گی۔ پوڈر ختم ہو گیا ہو گا۔ دس سے لیکر ساڑھے بارہ بجے تک کناٹ پلیس حسین عورتوں سے بھرا رہتا ہے شوہروں کے دفتروں میں چلے جانے کے بعد دہلی کی نوجوان عورتیں ہرنیوں کی طرح قطاروں کی قطاروں میں گھومتی ہیں۔ کناٹ پلیس میں گھومتی گھومتی جب یہ تھک جائے گی تو کوکا کولا پیئے گی۔ اپنے شوہر کے لئے چیونگم اور اپنے بچے کے لئے لالی پاپ خرید لے گی۔ ایک ڈیڑھ بجے اس سے پہلے کہ اس کا شوہر گھر پہنچے یہ بس میں سوار ہو کر واپس گھر پہنچ جائے گی..... اس طرح یہ خوش۔ اس کا شوہر خوش' اس کا بچہ خوش' اور اس کا خدا خوش۔ اس کی زندگی کا ایک حسین دن اور کم ہو جائے گا۔"

میرے بازو کا وہ حصہ جو ابھی تک اس کے بازو سے چھو رہا تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے من من بھر کا ہو گیا ہو' جیسے میرے بازو کا وہ حصہ درمیان کے کوٹوں اور قمیضوں کی پابندیاں دور کر چکا ہے' جیسے میرے بازو کا وہ حصہ ساتھ والے بازو سے جڑ گیا ہو۔

یکا یک میں چونک پڑا جیسے میں کوئی بہت بڑا گناہ کر رہا تھا۔ جیسے میں بے انصافی کر رہا تھا اپنی بیوی سے' اپنے بچے سے' اپنے اخلاق سے' اور اپنے مذہب سے..... اس ٹھنڈی یخ صبح کے وقت میرا جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری بیوی مجھے کوس رہی ہے۔ میرا بچہ جیسے میرے پاس کھڑا مجھے گھور رہا ہو۔

میرے سارے جسم پر بار بار ایک لرزہ سا طاری ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں بالکل سرد پڑ گیا ہوں۔ اب نہ تو میرا بازو میری ہمسفر کے بازو سے چھو رہا تھا اور نہ میرا کوٹ اس کے کوٹ سے ٹکرا رہا تھا۔ میری سیٹ پر جو جگہ تھی میں خود بخود سمٹ سمٹا کر اس پر بیٹھ گیا تھا۔

بس چلی جا رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ پر تمام فوجی سپاہی بس سے اتر گئے۔ اب دوسری طرف ٹانگیں رکھنے کے لئے جگہ خالی ہو گئی تھی اور میں اس طرف ٹانگیں سرکا کے قدرے آرام اور سکون سے بیٹھ گیا۔

بس میں جب ہجوم کم ہوا تو چاروں طرف سے ہوا آنے لگی۔ گھٹن سے نجات پا کر مسافر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے اور دفتروں کے بابو اپنے ساتھ لائے ہوئے اخبارات پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

بس چلی جا رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ سے ایک تیرہ چودہ سال کی معصوم لڑکی بس میں سوار ہو گئی کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہوتی تھی اس نے ایک نظر بس میں چاروں طرف بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف دیکھا اور پھر ایک ہاتھ میں کتاب پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی میری سیٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے سوچا' ابھی کوئی مسافر اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس معصوم کو بیٹھنے کے لئے کہے گا مگر دفتروں کے تمام بابو اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہے۔ چھاؤنی کے کچھ دوکاندار بھی اس سے بے خبر اپنی باتوں میں لگے رہے۔ تمام مرد بیٹھے ہوئے تھے اور وہ شرم و حیا میں ڈوبی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔

میرے دل نے کہا۔

"آخر تو اپنی سیٹ اس کے لئے خالی کیوں نہیں کر دیتا؟"

لیکن میں نے اپنے دل کی یہ بات جیسے سنی ان سنی کر دی بار بار میرا دل مجھے غیرت دلا رہا تھا اور بار بار میں اسے ایسے نظر انداز کر رہا تھا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو' جیسے مجھے کوئی لالچ ہو' یا جیسے مجھے کوئی لطف آ رہا ہو۔ میں بے شرم بن کر بار بار اندر کے اشارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی میری ہمسفر مجھے دیکھ رہی ہے۔ دیکھے جا رہی ہے۔ دیکھے جا رہی ہے میں نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا تو واقعی وہ مجھے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

بس چلی جا رہی تھی۔ فر فر تازہ اور صاف ہوا آ رہی تھی۔ مسافروں کی باتیں اور آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

میں نے ایک نظر اپنی ہمسفر پر ڈالی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میری نظریں اچک اچک کر بار بار اس کی طرف جا رہی تھیں۔

میں نے دیکھا.... اس کے پاؤں کے ناخنوں پر لگی ہوئی سرخ پالش کہیں لگی ہوئی تھی اور کہیں سے اتری ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں کی انگلیاں موٹی موٹی اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ اتنی گوری نہیں تھی جتنا کہ انگلیوں کی مالکہ کا چہرہ اور انگ انگ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں قدرے ٹیڑھا رکھا ہوا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ اس کے پاؤں کی ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں ایک لمبی عمر تک ننگے پاؤں گھر کا کام کاج کرتے رہنے کی وجہ سے ہندو عورتوں کی ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔

میں نے دیکھا..... اس کی شلوار کے ایک پائنچے پر بالکل سامنے کی طرف کیچڑ کا ایک داغ تھا۔ کیچڑ سوکھ کر مٹی جھڑ گئی تھی لیکن اس کے داغ کا نشان باقی تھا۔ شلوار کا دوسرا پائنچہ نیچے سے گھسا ہوا تھا شاید چلتے میں پاؤں تلے آ کر ایسا ہو گیا تھا۔ قمیض کے اگلے حصے پر دو چار سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں جو تازہ معلوم نہیں ہوتی تھیں..... اور مجھے اپنی ایک حسین دوست یاد آ گئی جو کسی لباس کو چاہئے چند لمحوں کے لئے ہی پہنے مگر دوسری بار استری کئے بغیر ہاتھ نہیں لگاتی۔

میں نے دیکھا..... اس کے بالوں میں جگہ جگہ پنیں لگی ہوئی تھیں یہ پنیں بالوں کو نیچے کرنے کے لئے' بالوں کو اوپر کرنے کے لئے' بالوں کو ٹیڑھا کرنے کے لئے اور بالوں کو دوہرا کرنے کے لئے لگی ہوئی تھیں۔ سر کے پچھلی طرف ان کا جوڑ اتنا بڑا اور بھاری تھا لیکن اس پر بھی اس نے اپنے سیاہ بالوں میں ایک کالا چٹلا لپٹا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا..... اس کے چہرے پر کریم کی ایک ہلکی سی تہہ تھی جس پر پوڈر اور سرخی لگی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک قدرے زیادہ ہی شوخ نظر آ رہی تھی۔ لبوں پر جہاں جہاں اس کی زبان لگ چکی تھی وہاں لپ اسٹک ذرا مدہم پڑ گئی تھی۔

میں نے دیکھا..... اس کے کانوں میں کانٹے تھے۔ کانٹے قدرے بڑے تھے۔ اس کے چہرے پر کانٹے اس سے ذرا چھوٹے ہونا چاہیے تھے۔

جوں جوں میں اپنی ہمسفر کو اور زیادہ دیکھتا میرے منہ کا ذائقہ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ میرا دل پشیمان سا ہو رہا تھا اور میری آنکھوں کا نشہ جیسے اترا اترا سا محسوس ہو رہا تھا۔

بس چلی جا رہی تھی۔

اخبارات پڑھنے والے مسافر کئی کئی صفحات الٹ چکے تھے۔ آپس میں باتیں کرنے والے اور زیادہ اونچی آواز میں بول رہے تھے۔

جب بس اگلے اسٹاپ پر رکی تو ایک عورت سوار ہو کر ہمارے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی مزدور کی بیوی معلوم ہو رہی تھی۔ یکا یک میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی سیٹ اس عورت کے لئے خالی کر دی۔ میں اب کھڑا تھا ایک دو اور مسافر بھی کھڑے ہونے والے آ گئے تھے۔

بس چلی پڑی۔

اگلے اسٹاپ سے اور سواریاں آ گئیں اور کھڑے ہونے کی جگہ پھر سے بھر گئی۔ اخبار پڑھنے والوں نے اپنے پرچے رکھ دیئے اور باتیں کرنے والوں کی باتیں دھیمی ہو گئیں۔

بس چلی جا رہی تھی۔

میں کھڑے کھڑے بس کے اگلے حصے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گھوم کر اپنی سیٹ کی طرف دیکھا تو اس پر مزدور عورت بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی اور مزدور عورت کے ساتھ میری ہمسفر اسی طرح کسی بت کی مانند خاموش اور بے پروا بیٹھی خوشبو بکھیر رہی تھی۔

میں نے پھر دیکھا۔ مجھے ادھر سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اس کے کوٹ کا ہلکا نیلا رنگ اس کے چہرے کو اور رونق بخش رہا تھا۔ اس کے یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ جیسے جم چکی تھی۔ اس کے گالوں پر شگفتگی ناچ رہی تھی۔ اس کی سوئی سوئی اداس آنکھوں میں لاکھوں جادو چھپے ہوئے تھے۔ اس کے بال' اس کا جوڑا' اس کا ماتھا' اس کی ناک' اس کے چہرے کے خدوخال یوں تھے جیسے اجنتا کے کسی بت کے ہوں۔ اب اس کے کانوں میں کانٹے بڑے نہیں معلوم ہو رہے تھے بالکل اتنے ہی تھے جتنا انہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس کے گول چہرے کو لمبا کر رہے تھے۔ بس چلی جا رہی تھی۔ میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ کریم رنگ کے سوٹ میں وہ لڑکی مجھے یوں لگی جیسے عرش سے کوئی پری اتر آئی ہو۔ جیسے سندر سپنا حقیقت بن گیا ہو۔ بس چلی جا رہی تھی۔ کھڑکی سے دھوپ کی ایک کرن اس حسین ہمسفر کے چہرے پر آ کر گرنے لگی موسم سرما کی صبح کی ہلکی تپش والی دھوپ۔ ایک دم ایسے لگا جیسے وہ ساری کی ساری کھل گئی ہو۔

بس اس اسٹاپ پر پہنچ چکی تھی جہاں مجھے اترنا تھا۔ میں نے اس پری کی طرف دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ کومل' نازک اور سندر۔ وہ مجھے یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی نہایت پیارا پھول نازک پتیوں میں مہک رہا ہو۔ کسی باغ کا کوئی حسین پھول جس کے پاس بورڈ پر لکھا ہوا ہو۔

"پھول توڑنا منع ہے"

مغل بچہ

عصمت چغتائی

فتح پور سیکری کے سنسان کھنڈروں میں گوری دادی کا مکان پرانے سوکھے زخم کی طرح کھٹکتا تھا۔ ککیا اینٹ کا دو منزلہ گھٹا گھٹا سا مکان ایک مار کھائے روٹھے ہوئے بچے کی طرح لگتا تھا۔ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا وقت کا بھونچال اس کی ڈھٹائی سے عاجز آ کر آگے بڑھ گیا اور شاہی شان و شوکت پر ٹوٹ پڑا۔

گوری دادی سفید جھک چاندنی بچھے تخت پر سفید بے داغ کپڑوں میں ایک سنگ مرمر کا مقبرہ معلوم ہوتی تھیں۔ سفید ڈھیروں بال' بے خون کی سفید دھوئی ہوئی ململ جیسی جلد' ہلکی کرنجی آنکھیں جن پر سفیدی رینگ آئی تھی' پہلی نظر میں سفید لگتی تھی۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ جیسے بسی ہوئی چاندنی کا غبار ان کے گرد معلق ہو۔

نہ جانے کب سے جئے جا رہی تھیں۔ لوگ ان کی عمر سو سے اوپر بتاتے تھے۔ کھلی کھلی گم سم بے نور آنکھوں سے وہ اتنے سال کیا دیکھتی رہی تھیں۔ کیا سوچتی رہی تھی۔ کیسے جیتی رہی تھیں۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں وہ میری اماں کے چچا زاد سے بیاہی تو گئی تھیں مگر انہوں نے دلہن کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھایا۔ کنوار پن کی ایک صدی انہوں نے انہی کھنڈروں میں بتائی تھی۔ جتنی گوری بی سفید تھیں اتنے ہی ان کے دولہا سیاہ بھٹ تھے۔ اتنے کالے کہ ان کے آگے چراغ بجھے! گوری بی بجھ کر بھی دھواں دیتی رہیں۔

سرشام کھانا کھا کر جھولیوں میں سوکھا میوہ بھر کے ہم بچے لحافوں میں دبک کر بیٹھ جاتے اور پرانی زندگی کی ورق گردانی شروع ہو جاتی بار بار سن کر بھی جی نہ بھرتا۔ اولا بدلا کر گوری بی

اور کالے میاں کی کہانی دہرائی جاتی۔ بیچارے کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ اتنی گوری گوری دلہن کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھایا۔

اماں سال کے سال پورا لاؤ لشکر لے کر میکے پر دھاوا بول دیتیں۔ بچوں کی عید ہو جاتی فتح پور سیکری کے پراسرار شاہی کھنڈروں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے جب شام پڑ جاتی تو کھوئی کھوئی سرمئی فضا سے ڈر لگنے لگتا۔ ہر کونے سے سائے لپکتے دل دھک دھک کرنے لگتے۔

"کالے میاں آ گئے۔" ہم ایک دوسرے کو ڈراتے۔ گرتے پڑتے بھاگتے اور لکیا اینٹ کے دو منزلہ مکان کی آغوش میں دبک جاتے۔ کالے میاں ہر اندھیرے کونے میں بھوت کی طرح چھپے محسوس ہوتے۔ بہت سے بچے مرنے کے بعد حضرت سلیم چشتی کی درگاہ پر ماتھا رگڑا۔ تب گوری بی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک گوری بی بڑی ضدی تھیں۔ بات بات پر اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ جاتیں۔ بھوک ہڑتال کر دیتیں گھر میں کھانا پکتا' کوئی منہ نہ جھٹالتا جوں کا توں اٹھوا مسجد میں بجھوا دیا جاتا' گوری بی نہ کھاتیں تو اماں بابا کیسے نوالہ توڑتے۔

بات اتنی سی تھی کہ جب منگنی ہوئی تو لوگوں نے مذاق میں چھینٹے کیے۔

"گوری دلہن کالا دولہا۔"

مگر مغل بچے مذاق کے عادی نہیں ہوتے۔ سولہ سترہ برس کے کالے میاں اندر ہی اندر گھٹتے رہے۔ جل کر مرنڈا ہوتے رہے۔

"دلہن میلی ہو جائے گی خبردار یہ کالے کالے ہاتھ نہ لگانا۔"

"بڑے نازوں کی پالی ہے تمہاری تو پرچھائیں پڑی تو کالی ہو جائے گی۔"

"بڑا تیہا ہے ساری عمر جوتیاں اٹھوائے گی۔"

انگریزوں نے جب مغل شاہی کا انتم سنسکار کیا تو سب سے بری مغل بچوں پر بیتی کہ وہ زیادہ عہدے سنبھالے بیٹھے تھے۔ جاہ جاگیر چھن جانے کے بعد لاکھ کے گھر دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی ڈھنڈار حویلیوں میں مغل بچے بھی پرانے سامان کی طرح جا پڑے۔ بھونچکے سے رہ گئے جیسے کسی نے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا۔

تب ہی مغل بچے اپنے غرور اور خودداری کی تار تار چادر میں سمٹ کر اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے گئے۔ مغل بچے اپنے محور سے کچھ کھسکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کھرے مغل کی یہی پہچان ہے کہ اس کے دماغ کے دو چار پیچ ڈھیلے یا ضرورت سے زیادہ تنگ ہوتے ہیں۔ عرش سے فرش کی طرف لڑھکے تو ذہنی توازن ڈگمگا گئے۔ زندگی کی قدریں غلط ملط ہو گئیں۔ دماغ سے زیادہ

جذبات سے کام لینے لگے۔

انگریز کی چاکری لعنت اور محنت مزدوری کسر شان' جو کچھ اثاثہ بچا اسے بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔ ہمارے ابا کے چچا روپیہ پیسہ کی جگہ چچی کے جہیز کے پلنگ کے پایوں سے چاندی کا پترا اکھیڑ کر لے جاتے تھے۔ زیور اور برتنوں کے بعد نکے جوڑے نوچ نوچ کر کھاتے۔ پان دان کی کلھیاں' سل بٹے سے کچل کر ٹکڑا ٹکڑا بیچیں اور کھائیں۔ گھر کے مرد دن بھر پلنگ کی ادوائن توڑتے۔ شام کو پرانی گھسی اچکن پہنی اور شطرنج پچیسی کھیلنے نکل گئے۔ گھر کی بیویاں چھپ چھپ کر سلائی کر لیتیں۔ چار پیسوں سے چولہا جل جاتا یا محلہ کے بچوں کو قرآن پڑھا دیتیں تو کچھ نذرانہ مل جاتا۔

کالے میاں نے دوستوں کی چھیڑ خانی کو جی کا گھاؤ بنا لیا جیسے موت کی گھڑی نہیں ٹلتی ویسے ہی باپ ماں کی طے کی ہوئی شادی نہ ٹلی۔ کالے میاں سر جھکا کے دولہا بن گئے۔ کسی سر پھری نے عین آرسی مصحف کے وقت اور چھیڑ دیا۔

"خبردار جو دلہن کو ہاتھ لگایا' کالی ہو جائے گی۔"

مغل بچہ چوٹ کھائے ناگ کی طرح پلٹا' سر سے بہن کا آنچل نوچا اور باہر چلا گیا۔

ہنسی میں کھسی ہو گئی۔ ایک ماتم برپا ہو گیا۔ مردان خانہ میں اس ٹریجڈی کی خبر ہنسی میں اڑا دی گئی۔ بغیر آرسی مصحف کے رخصت ایک قیامت تھی۔

"بخدا میں اس کا غرور چکنا چور کر دوں گا۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں مغل بچہ سے واسطہ ہے۔" کالے میاں پھنکارے۔

کالے میاں شہتیر کی طرح پوری مسہری پر دراز تھے دلہن ایک کونے میں گٹھڑی بنی کانپ رہی تھی۔ بارہ برس کی بچی کی بساط ہی کیا؟

"گھونگھٹ اٹھاؤ۔" کالے میاں ڈکرائے۔

دلہن اور گڑی مڑی ہو گئی۔

"ہم کہتے ہیں گھونگھٹ اٹھاؤ۔" کہنی کے بل اٹھ کر بولے۔ سہیلیوں نے تو کہا تھا۔ دولہا ہاتھ جوڑے گا۔ پیر پڑے گا پر خبردار جو گھونگھٹ کو ہاتھ لگانے دیا۔ دلہن جتنی زیادہ مدافعت کرے اتنی ہی زیادہ پاکباز۔

"دیکھو جی تم نوابزادی ہو گی اپنے گھر کی ہماری تو پیر کی جوتی ہو۔ گھونگھٹ اٹھاؤ ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں۔"

دلہن پر جیسے فالج گر گیا۔

کالے میاں چیتے کی طرح لپک کر اٹھے جوتیاں اٹھا کر بغل میں دابیں اور کھڑکی سے باغ میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ جودھپور دندنا گئے۔

گھر میں سوتا پڑا تھا۔ ایک اکا بی جو دلہن کے ساتھ آئی تھیں جاگ رہی تھیں۔ کان دلہن کی چیخوں کی طرف لگے تھے جب دلہن کے کمرے سے چوں بھی نہ آئی تو ان کے تو پیروں کا دم نکلنے لگا۔ ہے ہے کیسی بے حیا لڑکی ہے۔ لڑکی جتنی معصوم اور کنواری ہو گی اتنا ہی زیادہ دند مچائے گی۔ کیا کچھ کالے میاں میں کھوٹ ہے۔ جی چاہا کوئیاں میں کود کے قصہ پاک کریں۔

چپکے سے کمرے میں جھانکا تو جی سن سے ہو گیا۔ دلہن جیسی کی تیسی دھری تھی اور دولہا غائب!

بڑے غیر دلچسپ قسم کے ہنگامے ہوئے تلواریں کھنچیں بڑی مشکل سے دلہن نے جو بیتی تھی کہہ سنائی۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ خاندان میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کالے میاں کی دوسری گوری بی کی طرفدار۔

"وہ آخر خدائے مجازی ہے۔ اس کا حکم نہ ماننا گناہ ہے۔"

ایک پارٹی جمی ہوئی تھی۔

"کہیں کسی دلہن نے خود گھونگھٹ اٹھایا ہے؟" دوسری پارٹی کی دلیل تھی۔

کالے میاں کو جودھپور سے بلوا کر دلہن کا گھونگھٹ اٹھوانے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ وہاں گھوڑ سواروں میں بھرتی ہوگئے اور بیوی کو نان نفقہ بھیجتے رہے جو گوری بی کی اماں سمدھن کے منہ پر مار آتیں۔

گوری بی کلی سے پھول بن گئیں۔ ہر اٹھواڑے ہاتھ پیر میں مہندی رچاتی رہیں اور بندھے ٹکے دوپٹے اوڑھتی رہیں اور جیتی رہیں۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ باوا کی مرن گھڑی آپہنچی۔ کالے میاں کو خبر گئی تو نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ بھاگے آئے۔ باوا موت کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھے۔ کالے میاں کو طلب کیا دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے کی باریکیوں پر مسکوٹ ہوئی۔

کالے میاں نے سر جھکا دیا۔ مگر شرط وہی رہی کہ حشر ہو جائے مگر گھونگھٹ تو دلہن کو اپنے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا۔ "قبلہ و کعبہ میں قسم کھا چکا ہوں میرا سر قلم کر دیجئے۔ مگر قسم نہیں توڑ سکتا۔"

مغل بچوں کی تلواریں زنگھیا چکی تھیں۔ آپس کی مقدمہ بازیوں نے سارا کلف نکال دیا تھا۔ بس احتقانہ ضدیں رہ گئی تھیں' ایک انہیں کو کلیجے سے لگائے بیٹھے تھے۔ کسی نے کالے میاں سے نہ پوچھا تم نے ایسی احتقانہ قسم کھائی ہی کیوں کہ اچھی بھلی زندگی عذاب ہو گئی۔

خیر صاحب گوری بی پھر سے دلہن بنائی گئیں۔ ککیا اینٹ والا مکان پھر پھولوں اور شمامتہ العنبر کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ اماں نے سمجھایا۔ "تم اس کی منکوحہ ہو بیٹی جان۔ گھونگھٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں۔ اس کی ضد پوری کردو مغل بچہ کی آن رہ جائے گی۔ تمہاری دنیا سنور جائے گی' گودی میں پھول برسیں گے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہوگا۔"

گوری بی سر جھکائے سنتی رہیں۔ کچی کلی سات سال میں نوخیز قیامت بن چکی تھی۔ حسن اور جوانی کا ایک طوفان تھا جو ان کے جسم سے پھوٹا نکلتا تھا۔

عورت کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ سارے حواس اسی ایک نکتہ پر مرکوز تھے۔ مگر ان کی قسم ایک میخ دار آہنی گولے کی طرح ان کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔ ان کے تخیل نے سات سال آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ انہوں نے بیسیوں گھونگھٹ نوچ ڈالے رنڈی بازی' لونڈے بازی' بٹیربازی' کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی مگر گوری بی کے گھونگھٹ کی چوٹ دل میں پنجے گاڑے رہی۔ جو سات سال سہلانے کے بعد زخم بن چکی تھی۔ اس بار انہیں یقین تھا ان کی قسم پوری ہوگی۔ گوری بی ایسی عقل کی کوری نہیں کہ جینے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیں دو انگلیوں سے ہلکا پھلکا آنچل ہی تو سرکانا ہے کوئی پہاڑ تو نہیں ڈھونے۔

"گھونگھٹ اٹھاؤ" کالے میاں نے بڑی لجاجت سے کہنا چاہا مگر مغلئی دبدبہ غالب آگیا۔

گوری بیگم غرور سے تمتمائی سناٹے میں بیٹھی رہی۔

"آخری بار حکم دیتا ہوں۔ گھونگھٹ اٹھا دو ورنہ اسی طرح پڑی سڑ جاؤ گی' اب جو گیا' پھر نہ آؤں گا۔"

مارے غصہ کے گوری بی لال بھبھوکا ہو گئیں۔ کاش ان کے سلگتے رخسار سے ایک شعلہ لپکتا اور وہ منحوس گھونگھٹ خاکستر ہو جاتا۔

بیچ کمرے میں کھڑے کالے میاں کوڑیالے سانپ کی طرح جھومتے رہے۔ پھر جوتے بغل میں دبائے اور پائیں باغ میں اتر گئے۔

اب وہ پائیں باغ کہاں؟ ادھر پچھواڑے لکڑیوں کی ٹال لگ گئی۔ بس دو جامن کے پیڑ رہ گئے تھے اور ایک جنگلی بدگو بیلے چنبیلی کی روشیں' گلابوں کے جھنڈ' شہتوت اور انار کے

درخت کب کے لٹ پٹ گئے۔

جب تک ماں زندہ رہیں گوری بی کو سنبھالے رہیں ان کے بعد یہ ڈیوٹی خود گوری بی نے سنبھال لی۔ ہر جمعرات کو مہندی پیس کر پابندی سے لگاتیں دوپٹہ رنگ چن کر ٹانکتیں اور جب تک سسرال زندہ رہی تہوار پر سلام کرنے جاتی رہیں۔

اب کے جو کالے میاں گئے تو غائب ہو گئے۔ برسوں ان کا سراغ نہ ملا۔ ماں باپ رو رو کر اندھے ہو گئے' وہ نہ جانے کن جنگلوں کی خاک چھانتے پھرے۔ کبھی خانقاہوں میں ان کا سراغ ملتا۔ کبھی کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑے ملتے۔

گوری بی کے سنہری بالوں میں چاندی گھل گئی۔ موت کی جھاڑو کام کرتی رہی۔ آس پاس کی زمینیں مکان کوڑیوں کے مول بکتے گئے۔ کچھ پرانے لوگ زبردستی ڈٹ گئے۔ کنجڑے' قصائی آن بسے' پرانے محل ڈھے کر نئی دنیا کی بنیاد پڑنے لگی۔ پرچون کی دکان' ڈسپنسری ایک مرگھلا سا جنرل سٹور بھی اگ آیا' جہاں المونیم کی پتیلیاں اور لپٹن چائے کی پڑیوں کے ہار لٹکنے لگے۔

ایک مفلوج مٹھی کی دولت رس کر بکھر رہی تھی۔ چند محتاط انگلیاں سمیٹنے میں لگی تھیں۔ جو کل تک ادوائین پر بیٹھتے تھے جھک جھک کر سلام کرتے تھے آج ساتھ اٹھنا بیٹھنا کسر شان سمجھنے لگے۔

گوری بی کا زیور آہستہ آہستہ لالہ جی کی تجوری میں پہنچ گیا۔ دیواریں ڈھے رہی تھیں چھجے جھول رہے تھے' بچے کھچے مغل بچے افیون کا انٹا نگل کر پتنگوں کے پیچ لڑا رہے تھے۔ تیتر' بٹیر سدھا رہے تھے اور کبوتروں کی دموں کے پر گن کر ہلکان ہو رہے تھے۔ لفظ مرزا جو کبھی شان اور دبدبے کی علامت سمجھا جاتا تھا مذاق بن رہا تھا۔ گوری بیوی کولہو کے اندھے بیل کی طرح زندگی کے چھکڑے میں جتی اپنے محور پر گھومے جا رہی تھیں۔ ان کی کرنجی آنکھوں میں تنہائیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

ان کے لیے طرح طرح کے افسانے مشہور تھے کہ ان پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا۔ جونہی کالے میاں ان کے گھونگھٹ کو ہاتھ لگاتے چٹ تلوار سونت کر کھڑا ہو جاتا۔ ہر جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتی ہیں تب سارا آنگن کوڑیالے سانپوں سے بھر جاتا ہے۔ پھر سنہری کلغی والا سانپوں کا بادشاہ اجگر پر سوار ہو کر آتا ہے۔ گوری بی کی قرأت پر سر دھنتا ہے پو پھٹتے ہی سب ناگ رخصت ہو جاتے ہیں۔

جب ہم یہ قصے سنتے تو کلیجے اچھل کر حلق میں پھنس جاتے اور رات کو سانپوں کی

پھنکاریں سن کر سوتے میں چونک کر چیخیں مارتے۔

گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلائے ہوں گے۔ کیسے اکیلی نامراد زندگی کا بوجھ ڈھویا ہو گا۔ ان کے رسیلے ہونٹوں کو کبھی کسی نے نہیں چوما۔ انہوں نے جسم کی پکار کو کیا جواب دیا ہو گا؟

کاش یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی۔

پورے چالیس برس بعد کالے میاں اچانک آپ ہی آن دھمکے۔ انہیں قسم قسم کے لاعلاج امراض لاحق تھے۔ پور پور سڑ رہی تھی۔ روم روم رس رہا تھا۔ بدبو کے مارے ناک سڑی جاتی تھی۔ بس آنکھوں میں حسرتیں جاگ رہی تھیں۔ جن کے سہارے جان سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔

"گوری بی سے کہو مشکل آسان کر جائیں۔"

ایک کم ساٹھ کی دلہن نے روٹھے ہوئے دولہا کو منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مہندی گھول کر ہاتھ پیروں میں رچائی' پانی سمو کر پنڈا پاک کیا۔ سہاگ کا چکٹا ہوا تیل سفید لٹوں میں بسایا۔ صندوق کھول کر بور بور ٹپکتا جھڑتا بری کا جوڑا نکال کر پہنا اور ادھر کالے میاں دم توڑتے رہے۔

جب گوری بی شرماتی لجاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سرہانے پہنچیں تو جھلنگے پر چیکٹ تکئے اور گودڑ بستر پر پڑے ہوئے کالے میاں کی مٹھی بھر ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ موت کے فرشتے سے الجھتے ہوئے کالے میاں نے حکم دیا۔

"گوری بی گھونگھٹ اٹھاؤ"

گوری بی کے ہاتھ اٹھے مگر گھونگھٹ تک پہنچنے سے پہلے گر گئے۔

کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

وہ بڑے سکون سے اکڑوں بیٹھ گئیں' سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور رنڈاپے کا سفید آنچل ماتھے پر کھینچ گیا۔

لال اور پیلا

خواجہ احمد عباس

چاروں دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ نیلے نیلے کرشنا' گوری گوری پتلی کمر والی گوپیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ سفید پروں والے ہنس کنول کے پھولوں کے درمیان پانی میں کھڑے تھے۔ ایک مغل شہزادی جھروکے سے اپنے گھوڑ سوار عاشق کو جھانک رہی تھی۔ مہاتما بدھ سادھی لگائے مکتی کے دھیان میں کھوئے ہوئے بیٹھے تھے۔ ایک راجپوت حسینہ آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھنے میں مگن تھی..... خوب صورت چہرے' سڈول جسم' کٹیلی آنکھیں' ابھرے ہوئے سینے' لمبے لمبے کالے بال' کھلے ہوئے پھول' ناچتے ہوئے مور..... اور اوپر چھت پر رنگ برنگے بادل نیلے آسمان میں تیر رہے تھے۔ اور ان بادلوں سے ہوتی ہوئی بھگوان اندر کی سنہری رتھ چلی جا رہی تھی۔

گوپال کے اس چھوٹے سے تاریک کمرے میں آرٹ کی ایک دنیا آباد تھی۔ تخیّل کا مایا بازار لگا ہوا تھا جہاں حسن تھا' رومان تھا' رنگینی تھی' شانتی تھی۔

مگر جب کھڑکی میں سے اس نے باہر دیکھا تو وہاں اصلیت کی دنیا بسی ہوئی نظر آئی۔ نیچے گلی کے بیچوں بیچ ایک گندی نالی بہہ رہی تھی۔ ایک طرف کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک خارش زدہ کتا ایک مریل سی گندی سی بلی کو کاٹنے کے لیے دوڑ رہا تھا۔ موٹے موٹے چوہے کوڑے کے ڈھیر پر ایسے اطمینان سے گھوم رہے تھے' جیسے یہ ان کی سیر کرنے کی کوئی پہاڑی سڑک ہو..... گندی نالی کے کنارے ایک ادھ ننگا بچہ بیٹھا ہوا پاخانہ کر رہا تھا۔ نکڑ والی پنواڑن کی دکان کے سامنے چند گاڑی والے اور مزدور بیڑی پی رہے تھے اور پنواڑن سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ بچے

جو ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے ریل کا کھیل' کھیل رہے تھے' ایک طرف سے آئے اور چھک چھک کرتے سیٹی بجاتے ہوئے دوسری طرف سے گزر گئے۔

سامنے والی چال کے پیچھے ہی..... ایلومونیم کے برتنوں کا کارخانہ تھا جس کی ٹھک ٹھک کھٹ کھٹ دھڑ دھڑ دن رات چلتی رہتی تھی۔ چال کے چھت سے ملی ہوئی کارخانے کی چمنی تھی جو ہر وقت دھواں اگلتی رہتی تھی اور جب ہوا اس رخ کی چلتی تو دھواں ان ساری چالوں کی کھڑکیوں میں سے اندر آتا ہے ہر چیز پر..... دیواروں پر' کپڑوں پر' بستروں پر کالا پوڈر مل دیتا۔ اسی لیے جہاں تک ہوتا گوپال اپنے کمرے کی کھڑکیاں بند ہی رکھتا تھا کہ کہیں کارخانے کا دھواں اس کی تصویروں کو خراب نہ کر جائے۔ اس کے علاوہ کھڑکی کے باہر کا منظر اسے ہمیشہ برا لگتا تھا۔ جب کبھی وہ کھڑکی کھولتا اسے گندگی کے ڈھیر اور گندی نالی دیکھ کر ازحد کوفت ہوتی تھی۔ اور جتنی جلدی ممکن ہوتا وہ کھڑکی بند کر کے اپنے کلا بھون میں بند ہو جاتا۔ خوب صورت تصویروں میں گم ہو جاتا اور باہر کی اصلیت اور اس کی گندگی' بدبو اور شور کو بھول جاتا۔

مگر آج گرمی بہت تھی۔ بند کمرے میں دم گھٹ رہا تھا۔ اس لیے دھوئیں کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی گوپال نے کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ہی بدبو کا جھونکا آیا اور ساتھ ہی کارخانے کی چمنی کے دھوئیں کا غبار..... مگر آج اس نے کھڑکی کھلی رکھی اور دیر تک گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ ایک نئی نظر سے' اور آج اسے یہ گلی ایک نئی گلی نظر آئی.....

گوپال ایک مزدور تھا۔ سامنے والے ایلومونیم کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ مگر وہ ایک فن کار بھی تھا بلکہ اصل میں وہ ایک فن کار ہی تھا جو پیٹ پالنے کے لیے مزدوری کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں سے آٹھ گھنٹے کارخانے کی گرم اور بدبودار ہوا میں دوسرے پسینے میں نہائے ہوئے' میلے کچیلے کپڑے پہنے مزدوروں کے ساتھ وہ کام کرتا۔ باقی سولہ گھنٹے آرٹ اور تخیل کی دنیا میں بسر کرتا۔

ایک رومانی دنیا جہاں نہ مزدور تھے' نہ کارخانے' نہ دھواں' نہ بدبو' نہ گندگی بلکہ خوب صورت چہرے تھے۔ پھولوں سے ڈھکی ہوئی سرسبز وادیاں تھیں۔ اونچے اونچے برفیلے پہاڑ تھے۔ جب تک وہ اپنے کمرے میں رہتا' وہ اسی دنیا میں کھویا رہتا۔ جو کچھ بھی کارخانے سے مزدوری ملتی' اس میں سے کمرے کا کرایہ دینے اور ایک وقت کھانا کھانے کے بعد جو کچھ بھی بچتا اس سے رنگ خریدتا' آئیل پینٹ' واٹر کلر' کینوس' کاغذ' اور تصویریں بناتا رہتا۔ دیوتاؤں کی تصویریں جن

کے نقش اس کے دماغ پر بچپن سے جمے ہوئے تھے۔ خوبصورت عورتوں کی تصویریں جو صرف اس کے تخیل کی بستی میں تھیں۔ ان پھولوں کی تصویریں جنہیں اس نے کبھی سونگھا نہیں تھا۔ ان پھولوں کی تصویریں جن کو وہ کبھی خرید کر رکھ نہ سکا تھا۔ چند گھنٹے کے لیے وہ سوتا بھی تو وہ ان تصویروں کو سپنے میں دیکھتا رہتا' اور کبھی کبھی خواب میں اسے کوئی ایسا خوبصورت منظر دکھائی دے جاتا کہ وہ بے قرار ہو کر اسی وقت اٹھ کھڑا ہوتا اور لالٹین جلا کر پینٹ کرنا شروع کر دیتا۔ اس نے سینکڑوں کینوس لال پیلے کر ڈالے تھے۔ جب کینوس خریدنے کے لیے دام نہ ہوتے تو کاغذ پر تصویریں بناتا۔ کاغذ ختم ہو جاتے تو دیواروں پر' چھت پر' یہاں تک کہ ٹوٹی ہوئی کرسی کے تختے پر بھی دونوں طرف اس نے تصویریں بنا ڈالی تھیں۔

مگر جن چیزوں کی وہ تصویریں بناتا' ان کا اس کی اپنی زندگی سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں بھلا حسن کہاں تھا۔ یہاں تو غریبی' محنت' گندگی' بدبو تھی۔ اور گوپال کا خیال تھا کہ ان چیزوں کا آرٹ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آرٹ کو صرف خوب صورت چیزوں سے سروکار ہونا چاہیے اور خوب صورتی گوپال کو صرف اپنے تخیل میں میسر آسکتی تھی.....

گوپال تصویریں کیوں بناتا تھا؟ اس کا جواب شاید وہ خود بھی نہ دے سکتا تھا۔ اس کی کوئی تصویر آج تک نہ بکی تھی۔ کسی اخبار یا رسالے میں اس کی تصویروں کا ذکر کبھی نہ چھپا تھا۔ آرٹ کی دنیا میں کوئی اس کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ پھر وہ تصویریں کیوں بناتا تھا؟ شاید اس لیے کہ اس کا باپ تہواروں کے موقعہ پر مٹی سے دیوتاؤں کی مورتیاں بنایا کرتا تھا اور بچپن سے گوپال کو اپنے باپ کے رنگ چرا کر کاغذ پر لکیریں کھینچنے کا شوق ہو گیا تھا..... شاید اس لیے کہ اسکول میں ڈرائنگ کی کلاس کے سوا اور کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ اور ڈرائنگ ماسٹر نے اس کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ کر اس کی ہمت بڑھائی تھی۔ یا شاید اس لیے کہ گوپال غریب تھا اور ایک گندی گلی میں' ایک بدبودار چال میں رہتا تھا اور اسے اپنے من کی بھڑاس نکالنے کے لیے ایک نکاس کی ضرورت تھی! یتیم اور غریب گوپال کے دل میں خوبصورتی اور نرمی اور محبت کی ایک عجیب پیاس تھی جس کو تصویریں بنا کر ہی وہ بجھا سکتا تھا.....

گوپال تصویریں کیوں بناتا تھا؟ شاید اس لیے کہ جب وہ سترہ برس کا تھا اس نے ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔ ایک لڑکی جو اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ جو حسین تھی' امیر باپ کی بیٹی تھی اور غریب گوپال کی پہنچ سے باہر تھی۔ اور اس لیے اس محبت کا وہ کبھی اظہار نہ کر سکا تھا۔ وہ محبت اس کے دل ہی دل میں گھٹ رہی تھی مگر بجھی نہیں تھی۔ راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی

طرح چپ چاپ سلگتی رہتی تھی اور برسوں کے بعد جب وہ اپنا قصبہ چھوڑ کر بمبئی آ گیا تھا اور وہ لڑکی ایک ڈپٹی کلکٹر کے چار بچوں کی ماں بن چکی تھی' تب بھی محبت کا وہ جذبہ گوپال کے دل میں سلگ رہا تھا اور اس کے اظہار کا بھی ان تصویروں کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا!.....

رجنی کو گوپال نے صرف دیکھا تھا۔ کبھی اس سے بات بھی نہ کر پایا تھا بس دور سے اس کی پوجا کی تھی اور اسی لیے اب بھی بڑے ادب اور احترام سے اپنی تصویروں میں گوپال اس کی پوجا کر رہا تھا کبھی سرسوتی کے روپ میں تو کبھی شکنتلا کے' کبھی مغل شہزادی کے لباس میں' تو کبھی راجپوت راج کماری کے شنگھار میں۔ پجاری کی نگاہوں نے رجنی کو لافانی حسن کی ایک پتلی بنا دیا تھا۔ ایک شاعرانہ ہیولی..... ایک دیوی..... جس کو اس دنیا کی چلتی پھرتی بولتی چالتی خوب صورت لڑکیوں سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ جس کی آنکھیں ہرن جیسی تھیں اور کمر اتنی پتلی کہ گویا تھی ہی نہیں اور انگلیاں اتنی پتلی کہ.....

آج گوپال پھر رجنی کی یاد کو ایک نئی تصویر کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ اگلے ہفتے شہر میں آرٹ کی نمائش ہونے والی تھی اور گوپال اس میں ایک نئی تصویر بنا کر بھیجنا چاہتا تھا۔ ایسی تصویر جس میں اس کے پورے آرٹ کا نچوڑ ہو۔ جو سچ مچ شاہکار ہو جسے دیکھ کر ہر کوئی اس کے فن کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جائے..... کون جانتا ہے۔ شاید اس کی تصویر کو انعام بھی مل جائے..... مگر اس کا اصل مقصد نہ انعام تھا نہ شہرت۔ وہ تو اپنے من کے سلگتے ہوئے پریم کو آرٹ کے روپ میں امر کرنا چاہتا تھا۔ رجنی کی ایک ایسی تصویر بنا کر جس میں اس کا تمام حسن' اس کی جوانی' اس کی آنکھوں کی مستی' اس کے سڈول جسم کا ہر عضو ایسی خوب صورتی سے ابھر آئے کہ دنیا دیکھے اور عش عش کرے۔ اور شاید رجنی بھی اس تصویر کو کہیں دیکھے..... اور اتنے برس کے بعد اس تصویر کی زبان سے گوپال اپنی گونگی محبت کا سندیسہ رجنی تک پہنچا سکے.....

ہاں تو آج وہ رجنی کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔ خالی کینوس چوکھٹے پر چڑھا ہوا اس کے برش کی مار کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر رجنی کے گالوں میں سرخی بھرنے کے لیے گلابی رنگ چاہیے تھا اور آج گوپال کے پاس لال رنگ ختم ہو چکا تھا۔ بازار سے نیا رنگ خریدنے کے لیے پیسے بھی جیب میں نہیں تھے۔ اتنا لال رنگ بھی نہیں تھا کہ تصویر میں رجنی کے ماتھے پر ایک بندی ہی بنا سکے.....

پھر اس نے سوچا کہ میں رجنی کی تصویر نہیں کرشنا کی تصویر بناؤں گا۔ اس کے خوبصورت

نیلے بدن میں بچپن کی معصومیت اور ملائمت بھر دوں گا۔ اس کے چہرے پر امر بچپن کی شوخی اور شرارت ہو گی..... مگر آج اس کے پاس نیلا رنگ بھی تو نہیں تھا.....

تو پھولوں سے ڈھکی ہوئی ایک سرسبز پہاڑی..... دور سورج ڈوب رہا ہو اور سندر پہاڑنیں سروں پر گاگریں اٹھائے چشمے سے پانی لا رہی ہوں..... مگر اس کے پاس ہرا رنگ بھی نہیں تھا۔

لال رنگ نہیں تھا' گلابی نہیں تھا' پیلا نہیں تھا' سبز نہیں تھا' نیلا نہیں تھا' گیروا نہیں تھا..... بس ایک رنگ باقی تھا۔ کالا سیاہ رنگ..... کیوں کہ یہ رنگ اب تک اس نے اپنی تصویروں میں استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ مگر کالے رنگ سے کوئی خوبصورت رومانی تصویر تھوڑا ہی بنائی جا سکتی ہے۔ کالا رنگ تو اداسی کا رنگ ہے۔ غربتی اور بدصورتی کا رنگ ہے۔ دیویوں کا نہیں راکشسوں کا رنگ ہے۔ کالے رنگ سے رجنی کی تصویر نہیں بنائی جا سکتی..... بال کرشنا کی تصویر نہیں بن سکتی نہ کسی سندر راج کماری کی نہ مغل شہزادی کی..... نہ ہری بھری پھولوں سے لدی پہاڑی کی۔ نہ ڈوبتے ہوئے سورج کی رنگا رنگی کی..... اس بدصورت' بدہیبت' منحوس رنگ سے تو بس اس اندھیری' گندی' بدبودار گلی کی تصویر ہی بن سکتی ہے.....

اس گلی کی تصویر؟ نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ اس بھیانک منظر کی تصویر دیکھنا کون پسند کرے گا؟ مگر.....

اس بار گوپال نے کھڑکی کے باہر جھانک کر نیچے گلی کو دیکھا تو اسے چالوں کی ٹیڑھی میڑھی دیواروں میں' ان کے اوپر چھائی ہوئی چمنی اور اس سے نکلتے ہوئے دھوئیں میں' کھیلتے ہوئے بچوں میں' پنواڑن کی دکان کے آگے لگی ہوئی بھیڑ میں ایک عجیب انوکھا فنکارانہ نقشہ ابھرتا ہوا نظر آیا۔

چالوں کی دیواریں ایک دوسرے پر اس بے ڈھنگے انداز سے گری پڑ رہی تھیں' جیسے لڑکھڑاتے ہوئے شرابی ایک دوسرے کا سہارا لینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ دیواروں کے سائے زمین پر کالی تکونیں بنا رہے تھے۔ روشنی اور سایہ۔ سایہ اور روشنی۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی کرنوں نے ایک طرف کی دیواروں پر اجالا کر رکھا تھا اور دوسری طرف سایہ۔ روشن دیواروں پر کالی کالی کھڑکیاں ایسی لگتی تھیں جیسے اندھی بے نور آنکھیں..... کھیلتے ہوئے غریب بچے کٹھ پتلیاں لگتے تھے اور ان کے لمبے ترچھے سائے ایسے پڑ رہے تھے جیسے ان کے بھیانک مستقبل کی پرچھائیاں ابھی سے پڑ رہی ہوں۔ مریل بلی کے پیچھے دوڑتا ہوا خارش زدہ کتا کسی

ہزاروں برس پرانے زمانے کی یاد دلا رہا تھا جب جنگل کا قانون چلتا تھا اور ہر طاقت ور جانور اپنے سے کمزوروں کو نوالا بنانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ دیوار کے نیچے کھڑے ہوئے مزدوروں کی میلی کچیلی دھوتیوں میں سے نکلی ہوئی' کالی ٹانگیں ایسی لگتی تھیں جیسے وہ پتلے پتلے کالے کالے ستون ہوں' جن پر اس ساری عمارت کا بوجھ ہو۔ اور اوپر کھپریل کی تکونوں کے اوپر کارخانے کی چمنی ایک مہیب انگلی کی طرح آسمان کی طرف اشارہ کر رہی تھی..... اور اس میں سے نکلتا ہوا دھواں آسمان میں اس طرح پھیل رہا تھا جیسے کوئی سیاہ شیطانی پرچم ہوا میں لہرا رہا ہو.....

گوپال جو اس گلی اور اس کی ہر چیز سے نفرت کرتا تھا' اس کو بھی آج ماننا پڑا کہ اس منظر میں ایک تصویر ضرور ابھرتی نظر آتی تھی۔ ایک بھیانک اور بدصورت اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ شاید اس اندھیرے بد صورت منظر کو پینٹ کرانے کے لیے ہی قسمت نے اس سے تمام خوش نما لال اور پیلے اور نیلے اور سبز رنگ چھین لیے تھے.....

اور پھر اس نے سوچا' اچھا ایسا ہے تو یہی سہی۔ میں دو سال سے دیوی' دیوتاؤں' راج کماریوں' شہزادیوں کی رنگا رنگ تصویریں بناتا رہا ہوں اور دنیا نے انہیں دیکھنے اور پرکھنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں اپنے آرٹ کے مندر میں رجنی کی پوجا کرتا رہا ہوں۔ مگر اس نے کبھی بھولے سے بھی مجھے یاد نہیں کیا۔ میں نے اس کے چرنوں میں قوس قزح کے سارے رنگ رکھ دیئے مگر اس نے میری بھینٹ کو کبھی سویکار نہیں کیا۔ میں نے اپنے آرٹ کے لیے مزدوری کر کے' بھوکا رہ کر اپنی نیند اور آرام اور اپنے خون کی قربانی دی مگر کسی نے میرے آرٹ کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اب میں اس دنیا' اس سماج سے یہ بھیانک تصویر بنا کر ہی انتقام لوں گا تاکہ لوگ دیکھیں کہ کہاں اور کس حال اور ماحول میں غریب گمنام فن کار اپنی زندگی گزار رہا ہے اور اسی لمحے تصویر کا نام بھی بجلی کی طرح کوندتا ہوا اس کے دماغ میں آگیا۔ "جہاں میں رہتا ہوں"..... اپنے رنگوں کے ڈبے کو اٹھا کر وہ کھڑی میں لایا اور اس میں سے لال اور نیلے اور پیلے اور سبز رنگوں کی خالی پچکی ہوئی ٹیوبیں باہر گلی میں پھینک دیں اور کالے رنگ کی بھری ہوئی ٹیوب ایسے اٹھا لی جیسے وہ اس کا ہتھیار ہو۔

دو دن اور دو رات وہ برابر اس تصویر پر کام کرتا رہا..... کھانا پینا' نہانا دھونا' داڑھی بنانا' کپڑے بدلنا سب کچھ بھول گیا۔ اس کے دماغ میں دھن تھی تو یہی کہ اس اندھیری گندی گلی کی تصویر میں اس سارے سماج کی تصویر کھینچ کر رکھ دے جو اس اندھیرے اور گندگی کو پروان چڑھاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے کینوس پر نہ صرف گلی کے خدوخال نظر آنے لگے بلکہ اس

گلی کی روح بھی ابھر آئی..... اس روح کا احساس گوپال کو آج پہلی بار ہوا تھا۔ تصویر بناتے ہوئے اس نے اپنی گلی کو ایک نئے ڈھنگ سے دیکھا۔ کلاکار کی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی نگاہ گلی کی گندگی اور اندھیرے کو چیرتی ہوئی اس انسانیت تک پہنچی جو اس گندگی اور اندھیرے میں چھپی ہوئی تھی۔

اب گوپال نے دیکھا کہ اس کی گلی اینٹ، پتھر اور لکڑی کے ڈھیروں سے مل کر نہیں بنی، بلکہ ان انسانوں کی زندگی کے تانے بانے سے بنی ہے جو اس میں رہتے ہیں۔ پہلی بار اس نے دیکھا کہ یہاں کے رہنے والے جان بوجھ کر گندے نہیں رہتے، گندہ رہنے پر مجبور ہیں۔ اس نے دیکھا کہ پنواڑن کی دکان کے سامنے لگا ہوا نل صرف دو تین گھنٹے کے لیے چلتا ہے، وہ بھی صبح سویرے جب آس پاس کی سب چالوں کی عورتیں اپنی اپنی گاگریں لے کر پانی بھرنے آتی ہیں۔ اور پانی کی ایک ایک قیمتی بوند پر کتنا لڑائی جھگڑا ہوتا ہے اور پھر نل میں پانی آنا بند ہو جاتا ہے۔ کتنی ہی عورتیں خالی گاگریں لیے میونسپلٹی کو گالیاں دیتی ہوئی واپس چلی جاتی ہیں۔ سو اس نے اپنی تصویر میں صبح کا وقت ہی رکھا اور دکھایا کہ عورتوں کی قطار خالی گاگریں لیے انتظار میں کھڑی ہیں۔ ایک گاگر نل کے نیچے رکھی ہے اور نل میں سے ایک ایک بوند، صرف ایک بوند، ٹپک رہی ہے..... اب گوپال نے دیکھا کہ اس گلی کے رہنے والے گندے ہیں، مگر برے نہیں تھے۔ وہ آپس میں لڑتے تھے، گالم گلوچ کرتے تھے مگر ان کے دلوں میں کینہ اور لالچ نہیں تھا۔ وہ محنت مزدوری سے جھکے جھکے پریشان ضرور رہتے تھے مگر ان کے چہروں پر سے مسکراہٹ بالکل غائب نہ ہوئی تھی۔ وہ اب بھی ہنس سکتے تھے اور ہنستے تھے..... اور گوپال نے کوشش کی کہ یہ سب کچھ اس کی تصویر میں آ جائے۔ مگر جب تصویر بن کر تیار ہوئی تو گوپال کو اطمینان نہ ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ تصویر میں کسی چیز کی کمی ہے۔ گلی کی اس روح کی کمی تھی جو وہاں کے رہنے والوں کی ہنسی، مسکراہٹ، چیخ و پکار، بچوں کے کھیل کود میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس امید کی کمی تھی جو اس گلی کے رہنے والوں کے دلوں میں ابھی تک زندہ تھی..... مگر اس روح کو، امید کو، اس تڑپ اور جوش کو اس گلی کے مستقبل کو کیسے اس تصویر میں دکھائے؟ رات بھر گوپال کھڑکی میں بیٹھا یہی سوچتا رہا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا..... یہاں تک کہ سویرا ہو گیا اور سوتی ہوئی گلی آنکھیں ملتی ہوئی جاگ اٹھی۔ عورتیں پھر لائن بنا کر نل کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ پنواڑن نے اپنی دکان کو جھاڑنا پونچھنا شروع کر دیا۔ سویرے کی شفٹ والے مزدور کارخانے کو جانے لگے۔ کتنی ہی رسوئیوں سے دھواں نکل کر چمنی کے دھوئیں میں ملنے لگا۔ یہی سب کچھ تو اس نے اپنی تصویر

میں بھی دکھایا گیا تھا۔ مگر جب اس کی نگاہ چھتوں پر سے ہوتی ہوئی اوپر اٹھی تو دفعتاً اسے معلوم ہوا اس کی تصویر میں کس چیز کی کمی تھی؟ سرخی کی کمی تھی۔

سارے آسمان پر سویرے کی گلابی شفق پھوٹی ہوئی تھی' جیسے کسی حسینہ نے..... جیسے رجنی نے..... سوکر اٹھتے ہی اپنے چہرے پر پاؤڈر سرخی مل لی ہو اور اس گلابی آسمان کے پس منظر کے ساتھ گلی کی گندگی اور سیاہی تھی۔ کالی رات جو اب ختم ہو رہی تھی' جو سویرے کی سرخی میں گھلتی جا رہی تھی..... اس کی تصویر کے آسمان کو بھی سویرے کی' نئے دن کی' امید کی سرخی سے جگمگا اٹھنا چاہیے یہ احساس بجلی کی تیزی کے ساتھ اس کے دماغ پر چمکا۔ مگر یہ سرخی آئے کہاں سے؟ اس کے پاس لال رنگ تھا ہی نہیں۔ نہ بازار سے خریدنے کو پیسے تھے۔ نہ کسی سے ادھار لاسکتا تھا۔

مگر تصویر کے آسمان میں سرخی تو ضرور ہونی چاہیے.....

گوپال کو یاد آیا کہ اسی دن تصویر کو نمائش کے لیے بھیجنا ہے..... مگر سرخی نہ ہوئی تو تصویر مکمل نہ ہو گی' ادھوری رہے گی۔ ادھوری ہی نہیں جھوٹی ہو گی۔ مگر سرخی کہاں سے آئے؟

آسمان پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ مگر گوپال کے ہاتھ وہاں تک نہ پہنچ سکتے تھے کہ آسمان کے چہرے سے اتار کر اپنی تصویر میں سرخی بھر دے۔

تو کیا تصویر ادھوری رہے گی؟

نہیں نہیں..... گوپال کو ایسا لگ رہا تھا کہ تصویر ادھوری رہی تو اس کی زندگی' اس کی محنت' اور اس کا آرٹ سب بے کار ہو گا..... تین راتوں کو جاگنے کے بعد اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں بخار سے جل رہے تھے..... گال تمتما رہے تھے۔

اسے اپنا کمرہ' سب تصویریں' مہاتما بدھ' بھگوان کرشنا' ساوتری اور شکنتلا' مغل شہزادی اور راجپوت راج کماری' کنول کے پھول' ہری بھری وادیاں..... ہر چیز گھومتی ہوئی لگ رہی تھی..... بس ایک چیز اپنی جگہ قائم تھی۔ اس کی نئی بنائی ہوئی تصویر جو مکمل ہونے کے لیے' شاہ کار بننے کے لیے سرخی کے چند قطروں کی منتظر تھی.....

نہ جانے کیسے اور کب گوپال ایک ٹوٹے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جس میں دیکھ کر وہ شیو کرتا تھا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ داڑھی بڑھی ہوئی' بال پریشان اور گرد میں اٹے ہوئے قمیض کے کالر پر کالے پینٹ کے دھبے' آنکھوں میں لال لال ڈورے' تمتماتے ہوئے گالوں پر سرخی..... بخار میں جلتے ہوئے کھولتے ہوئے' دوڑتے ہوئے خون کی

سرخی۔

آرٹ نمائش میں سب سے زیادہ بھیڑ "جہاں میں رہتا ہوں" تصویر کے سامنے تھی۔ اوّل انعام بھی اسی کو ملا تھا۔

آرٹ کو سمجھنے والے، آرٹ کو پرکھنے والے، آرٹ کو خریدنے والے، آرٹ کو بیچنے والے، آرٹ کی دلالی کرنے والے، آرٹ کی پوجا کرنے والے، آرٹ کے بارے میں لمبی چوڑی ڈینگیں مارنے والے، سب ہی وہاں موجود تھے۔ سب ہی گوپال کی تعریف کر رہے تھے۔

"یہ ہے سچی کلا۔"

"زندگی کا اصلی روپ۔"

"کتنی جان ہے اس تصویر میں، منہ سے بولتی ہے۔"

"گوپال نے تصویر نہیں بنائی، زندگی کو آئینہ دکھایا ہے۔"

"مگر دو سو روپے بہت ہیں اس تصویر کے۔"

"آرٹ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔"

"اس تصویر سے رومانی آرٹ کا دور ختم اور نئے آرٹ کا دور شروع ہوتا ہے۔"

"کتنی گہری نگاہ ہے آرٹسٹ کی۔ ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز تک پہنچتی ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ آرٹسٹ نے مہینوں اس گلی میں جا جا کر وہاں کے غریبوں کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔"

"اس پوری گلی کو کالے رنگ سے پینٹ کیا ہے..... اس خیال کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ کتنی اداسی ہے اس سیاہی میں۔ کتنا دکھ، کتنا درد، کتنا گہرا سناٹا۔ جیسے ایک گلی کی تصویر نہ ہو..... دنیا کے سارے غریبوں کی زندگی کی تصویر ہو....."

"ہاں..... مگر آسمان پر جو شفق کی سرخی ہے..... اصل کمال تو یہ ہے جس سے تصویر کا مطلب ہی بدل جاتا ہے۔ بجائے مایوسی اور نراش کے یہ تصویر عوام کے روشن مستقبل کی جھلک دکھاتی ہے۔"

"یہ سرخ رنگ کا استعمال واقعی خوب کیا ہے۔"

"اور یہ معمولی رنگ نہیں ہے..... یہ خون کی طرح سرخ ہے جس میں ہلکی ہلکی سیاہی دوڑتی جا رہی ہے....."

آرٹسٹ نے جان کر یہ رنگ استعمال کیا ہے..... گویا نئے سویرے کی سرخی عوام کے

خون سے پیدا ہوتی ہے۔"

عوام کے خون سے یا آرٹسٹ کے خون سے؟"

اور اس پر سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اتنے میں کسی نے کہا۔

"گوپال آرٹسٹ کو بھی دیکھا؟"

سب کی نگاہیں گھوم گئیں۔ "کہاں؟ کدھر؟"

"وہ کیا ہے۔ دبلا سا' سوکھا سا نوجوان جو دیوار کا سہارا لیے دور سے اپنی تصویر کی طرف دیکھ رہا ہے۔"

"جی نہیں۔ وہ نہیں ہو سکتا۔ اتنا بڑا آرٹسٹ اور ایسے پھٹے پرانے کپڑے؟"

"مگر میں کہتا ہوں یہی ہے گوپال۔"

"بیمار معلوم ہوتا ہے بے چارہ..... چہرے کا رنگ تو دیکھو۔ بالکل پیلا لگتا ہے۔ بدن میں خون ہے ہی نہیں۔"

کارمن

قراۃ العین حیدر

رات کے گیارہ بجے ٹیکسی شہر کی خاموش سڑکوں پر گزرتی ایک پرانی وضع کے پھاٹک کے سامنے جا کر رکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کر بڑی قطعیت کے ساتھ میرا سوٹ کیس اتار کر فٹ پاتھ رکھا اور پیسوں کے لیے ہاتھ پھیلائے تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔

"یہی جگہ؟" میں نے شیشے سے پوچھا۔

"جی ہاں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نیچے اتری ٹیکسی گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی اور میں سنسان فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ تب میں نے بڑے دروازے میں جو کھڑکی لگی تھی اسے کھٹکھٹایا۔ کچھ بعد کھڑکی کھلی۔ میں نے چوروں کی طرح اندر جھانکا۔ اندر نیم تاریک آنگن تھا جس کے ایک کونے میں دو لڑکیاں رات کے کپڑوں میں ملبوس آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ آنگن کے سرے پر ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت ایستادہ تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے گھسیاری منڈی لکھنؤ کا اسکول یاد آگیا جہاں سے میں نے بنارس یونی ورسٹی کا میٹرک پاس کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا جہاں مکمل تاریکی طاری تھی۔ فرض کیجئے......... میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ جگہ اُچکیوں، بردہ فروشوں اور سمگلروں کا اڈّہ نکلی تو.........؟ میں ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں رات کے گیارہ بجے ایک گم نام عمارت کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی جو گھسیاری منڈی کے اسکول سے ملتا جلتا تھا۔ ایک لڑکی کھڑکی کی طرف آئی۔

"گڈ ایوننگ! یہ وائی، ڈبلیو، سی، اے ہے نا؟ میں نے ذرا عجز سے مسکرا کر پوچھا "میں نے

تار دلوایا تھا کہ میرے لیے ایک کمرہ ریزرو کر دیا جائے۔" مگر کس قدر بورخستہ حال وائی' ڈبلیو' سی' اے ہے یہ! میں نے دل میں سوچا۔

"ہمیں آپ کا تار نہیں ملا اور افسوس ہے کہ سارے کمرے گھرے ہوئے ہیں۔"

اب دوسری لڑکی آگے بڑھی ..... "یہ گرلز ہوسٹل ہے۔ یہاں عام طور پر مسافروں کو نہیں ٹھہرایا جاتا" اس نے کہا۔

میں یک لخت بے حد گھبرا گئی۔ اب کیا ہو گا؟ میں اس وقت یہاں سے کہاں جاؤں گی؟ دوسری لڑکی میری پریشانی دیکھ کر خوش خلقی سے مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں گھبراؤ مت اندر آ جاؤ۔ لو ادھر سے کود آؤ۔"

"مگر کمرہ تو خالی نہیں ہے....." میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میرے لیے جگہ کہاں ہو گی؟"

"ہاں ہاں کوئی بات نہیں ہم جگہ بنا دیں گے۔ اب اس وقت آدھی رات کو تم کہاں جا سکتی ہو؟" اسی لڑکی نے جواب دیا۔ میں سوٹ کیس اٹھا کر کھڑکی سے اندر آنگن میں کود گئی۔ لڑکی نے سوٹ کیس مجھ سے لے لیا۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے میں نے جلدی جلدی کہا "بس آج کی رات مجھے ٹھہر جانے دو میں کل صبح اپنے دوستوں کو فون کر دوں گی۔ میں یہاں تین چار لوگوں کو جانتی ہوں۔ تم کو بالکل زحمت نہ ہو گی۔"

"فکر مت کرو....." اس نے کہا۔ پہلی لڑکی شب بخیر کہہ کر غائب ہو گئی۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔ برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کی دیواریں بنا کر ایک کمرہ سا بنا دیا گیا تھا۔ لڑکی سرخ پھولوں والا دبیز پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گئی۔" یہاں میں رہتی ہوں تم بھی یہیں سو جاؤ۔" اس نے سوٹ کیس ایک کرسی پر رکھ دیا اور الماری میں سے صاف تولیہ اور نیا صابن نکالنے لگی۔ ایک کونے میں چھوٹے سے پلنگ پر مچھر دانی لگی تھی۔ برابر میں سنگھار میز رکھی تھی اور کتابوں کی الماری۔ جیسے کمرے ساری دنیا میں لڑکیوں کے ہوسٹلوں میں ہوتے ہیں..... لڑکی نے فوراً دوسری الماری سے چادر اور کمبل نکال کر فرش کے گھسے ہوئے بد رنگ قالین پر بستر بچھا دیا۔ اور پلنگ پر نئی چادر بچھا کر مچھر دانی کے پردے گرا دیئے۔

"لو تمہارا بستر تیار ہے۔"

مجھے بے حد ندامت ہوئی۔ "سنو میں فرش پر سو جاؤں گی۔"

"ہر گز نہیں۔ اتنے مچھر کاٹیں گے کہ حالت تباہ ہو جائے گی۔ ہم لوگ ان مچھروں کے عادی ہیں۔ کپڑے بدل لو۔" اتنا کہہ کر اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئی۔ "میرا نام کارمن میں ایک دفتر میں ملازم ہوں اور شام کو یونی ورسٹی میں ریسرچ کرتی ہوں۔ کیمسٹری میرا مضمون ہے۔ میں وائی' ڈبلیو' سی' اے کی سوشل سیکرٹری بھی ہوں اب تم اپنے متعلق بتاؤ۔"

میں نے بتایا۔

"اب سو جاؤ۔" مجھے اونگھتے دیکھ کر اس نے کہا۔ پھر اس نے دو زانو جھک کر دعا مانگی اور فرش پر لیٹ کر سو گئی۔ صبح کو عمارت جاگی۔ لڑکیاں سروں پر تولیے لپیٹے اور ہاؤس کوٹ پہنے غسل خانوں سے نکل رہی تھیں۔ برآمدے میں سے گرم قہوے کی خوش بو آ رہی تھی۔ دو تین لڑکیاں برآمدے میں ٹہل ٹہل کر دانتوں پر برش کر رہی تھیں۔

"چلو تمہیں غسل خانہ دکھا دوں۔" کارمن نے مجھ سے کہا اور ہال سے گزر کر ایک گلیارے میں لے گئی۔ جس کے سرے پر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھری تھی جس میں صرف ایک نل لگا تھا۔ اور دیوار پر ایک کھونٹی گڑی تھی۔ اس کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور دیواروں پر سیلن تھی۔ روشن دان کے ادھر سے کسی لڑکی کے گانے کی آواز آ رہی تھی اس غسل خانے کے اندر کھڑے ہو کر میں نے سوچا کیسی عجیب بات ہے..... مدتوں سے یہ غسل خانہ اس ملک میں' اس شہر میں' اس عمارت میں اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اور میرے وجود سے بالکل بے خبر..... اور آج میں اس میں موجود ہوں..... کیسا بے وقوفی کا خیال تھا۔

جب میں نہا کر باہر نکلی تو نیم تاریک ہال میں ایک چھوٹی سی میز پر میرے لیے ناشتہ چنا جا چکا تھا۔ کئی لڑکیاں جمع ہو گئی تھیں۔ کارمن نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ بہت جلد ہم سب پرانے دوستوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے....." اب میں ذرا اپنے جاننے والوں کو فون کر دوں۔" چائے ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

کارمن شرارت سے مسکرائی "ہاں اب تم اپنے بڑے بڑے مشہور اور اہم دوستوں کو فون کر دو اور ان کے وہاں چلی جاؤ۔ تمہاری پروا کون کرتا ہے..... کیوں روزا؟..... ہم اس کی پروا کرتے ہیں؟"

"بالکل نہیں۔" کورس ہوا۔

لڑکیاں میز پر سے اٹھیں "ہم لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں۔ شام کو تم سے ملاقات ہو گی۔"

میگد یلنا نے کہا۔

"شام کو.....؟" ا یمیلیا نے کہا" شام کو یہ کسی کنٹری کلب میں بیٹھی ہو گی۔" کارمن کے دفتر جانے کے بعد میں نے برآمدے میں جاکر فون کرنے شروع کیے۔

فوج کے میڈیکل چیف میجر جنرل گلڈاس جو جنگ کے زمانے میں میرے ماموں کے رفیق کار رہ چکے تھے۔ مسز انطونیا کوسٹیلو..... ایک کروڑ پتی کاروباری کی بیوی جو یہاں کی مشہور سماجی لیڈر تھیں اور جن سے میں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں ملی تھی۔

انفانسو دلیرا..... اس ملک کا نامور ناول نگار اور جرنلسٹ جو ایک دفعہ کراچی آیا تھا..... ہلو۔ ہلو..... ارے تم کب آئیں۔ ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی؟ کہاں ٹھہری ہو.....؟ وہاں.....؟ گڈ گاڈ..... وہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ ہم فوراً تمہیں لینے آرہے ہیں۔" ان سب نے باری باری مجھ سے یہی الفاظ دہرائے۔ سب سے آخر میں نے ڈون گارسیاڈیل پریڈوس کو فون کیا۔ یہ مغربی یورپ کے ایک ملک میں اپنے دیس کے سفیر رہ چکے تھے اور وہیں ان سے اور ان کی بیوی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ان کی سیکرٹری نے بتایا کہ وہ لوگ آج کل پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں۔ اس نے میری کال ان کے پہاڑی محل میں منتقل کر دی۔

تھوڑی دیر بعد مسز کوسٹیلو اپنی مرسی ڈیز میں مجھے لینے آگئیں۔ کارمن کے کمرے میں آ کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ مجھے دھکا سا لگا۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ یہ کارمن' ا یمیلیا' برنارڈا' دروزا' اور میگد یلنا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

"سامان ابھی رہنے دیجیے۔ شام کو دیکھا جائے گا۔" میں نے ذرا جھینپ کر مسز کوسٹیلو سے کہا۔

"مگر تم کو اس نامعقول جگہ پر بے حد تکلیف ہو گی۔" وہ برابر دہراتی رہیں رات کو جب میں واپس آئی تو کارمن اور ا یمیلیا پھاٹک کی کھڑکی میں ٹھنسی میرا انتظار کر رہی تھیں "آج ہم نے تمہارے کمرے کا انتظام کر دیا ہے۔" کارمن نے کہا۔ میں خوش ہوئی کہ اب اسے فرش پر نہ سونا پڑے گا۔

ہال کی دوسری طرف ایک اور سیلے ہوئے کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے ایک پر میرے لیے بستر لگا تھا دوسرے پر مسز سوریل بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ وہ اڑتیس انتالیس سال کی رہی

ہوں گی۔ ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اداسی تھی۔ یولینزین نسل کی کس شاخ سے ان کا تعلق تھا' ان کی شکل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ پلنگ پر نیم دراز ہو کر انہوں نے فوراً اپنی زندگی کی کہانی شروع کر دی "میں گام سے آئی ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "گام کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بحرالکاہل میں ایک جزیرہ ہے۔ اس پر امریکن حکومت ہے۔ وہ اتنا چھوٹا جزیرہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر اس کے نام کے نیچے صرف ایک نقطہ لگا ہوا ہے۔ میں امریکن شہری ہوں۔" انہوں نے ذرا فخر سے اضافہ کیا..... گام..... میں نے دل میں دہرایا۔ کمال ہے۔ دنیا میں کتنی جگہیں ہیں اور ان میں بالکل ہمارے جیسے لوگ بستے ہیں۔

"میری ایک لڑکی وائلن بجانے والے کے ساتھ بھاگ آئی ہے۔ میں اسے پکڑنے آئی ہوں۔ وہ صرف سترہ سال کی ہے۔ مگر حد سے زیادہ خودسر..... یہ آج کل کی لڑکیاں....." پھر وہ دفعتاً" اٹھ کر بیٹھ گئیں..... مجھے کینسر ہو گیا تھا۔

"اوہ....." میرے منہ سے نکلا۔

"مجھے سینے کا کینسر ہو گیا تھا۔" انہوں نے بڑے الم سے کہا "ورنہ تین سال قبل..... میں بھی..... اور سب کی طرح نارمل تھی۔"

ان کی آواز میں بے پایاں کرب تھا....." دیکھو....." انہوں نے اپنے نائٹ گون کا کالر سامنے سے ہٹا دیا..... میں نے لرز کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک عورت سے اس کے جسم کی خوب صورتی ہمیشہ کے لیے چھن جائے۔ کتنی قہرناک بات تھی۔

تھوڑی دیر بعد مسز سوریل سگریٹ بجھا کر سو گئیں۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے چاند اندر جھانک رہا تھا۔ نزدیک کے کمرے سے میگدلینا کے گانے کی آواز آنی بند ہو گئی۔ دفعتاً" میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔

اگلا ہفتہ فیشن ایبل رسالوں کی زبان میں "سوشل اور تہذیبی" مصروفیات کی آندھی کی طرح "آرٹ اور کلچر" کے معاملات میں گزرا۔ دن مسز کوسٹیلو اور ان کے احباب کے حسین' پر فضا مکانوں پر' شامیں شہر کی جگمگاتی تفریح گاہوں میں بسر ہوئیں۔ ہر طرح کے لوگ..... انٹلکچوئیل..... جرنلسٹ..... مصنف' سیاسی لیڈر مسز کوسٹیلو کے گھر آتے اور ان سے بحث و مباحثے رہتے۔ اور میں انگریزی محاورے کے الفاظ میں اپنے آپ کو گویا بے حد "اینجوائے" کر رہی تھی۔ میں رات کو وائی' ڈبلیو' واپس آتی اور ہال کی چوکور میز کے ارد گرد بیٹھ کر پانچوں

لڑکیاں بڑے اشتیاق سے مجھ سے دن بھر کے واقعات سنتیں۔ "کمال ہے.....!" روزا کہتی..... "ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں کہ یہاں ایسی الف لیلوی فضائیں بھی ہیں۔"

"یہ بے حد امیر لوگ جو ہوتے ہیں نا یہ اتنے روپے کا کیا کرتے ہیں؟ ا۔میلیا پوچھتی۔

ا۔میلیا ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ روزا ایک دفتر میں اسٹینو گرافر تھی۔ میگد یلنا اور برنارڈا ایک میوزک کالج میں پیانو اور وائلن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ یہ سب متوسط اور نچلے طبقے کی لڑکیاں تھیں۔

اتوار کی صبح کارمن ماس میں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کوئی چیز نکالنے کے لیے میں نے الماری کھولی تو اس کے جھٹکے سے اوپر سے ایک اونی خرگوش نیچے گر پڑا۔ میں اسے واپس رکھنے کے لیے اوپر اچکی تو الماری کی چھت پر بہت سارے کھلونے رکھے نظر آئے۔

"یہ میرے بچے کے کھلونے ہیں۔" کارمن نے سنگھار میز کے سامنے بال بناتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تمہارے بچے کے....." میں ہکا بکا رہ گئی اور میں نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ کارمن بن بیاہی ماں تھی۔

آئینے میں میرا ردعمل دیکھ کر وہ میری طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے کہا..... "تم غلط سمجھیں" پھر وہ کھلکھلا کر ہنسی اور اس نے الماری کی نچلی دراز میں سے ایک ہلکے نیلے کی چمکیلی "بے بی بک" نکالی دیکھو یہ میرے بچے کی سال گرہ کی کتاب ہے۔ جب وہ ایک سال کا ہو گا تو یہ کرے گا۔ جب دو سال کا ہو جائے گا تو یہ کہے گا۔ یہاں اس کی تصویریں چپکاؤں گی..... وہ اطمینان سے آلتی پالتی مار کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اس کتاب میں سے خوب صورت امریکن بچوں کی رنگین تصویروں کے تراشے نکال کر بستر پر پھیلا دیے۔ "دیکھو میری ناک کتنی چپٹی ہے۔ اور نک تو مجھ سے بھی گیا گزرا ہے تو ہم دونوں کے بچوں کی ناک کا سوچو کیا حشر ہو گا؟ میں اس کی پیدائش سے مہینوں پہلے یہ تصویریں دیکھا کروں گی تاکہ اس بے چارے کی ناک پر کچھ اثر نہ پڑے۔"

"تم دیوانی ہو اچھی خاصی' اور یہ نک کون بزرگ ہیں؟"

اس کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا....." ابھی اس کا ذکر نہ کرو اس کے نام پر مجھے لگتا ہے میرا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"

مگر اس کے بعد وہ برابر نک کا ذکر کرتی رہی "میں اتنی بد صورت ہوں مگر نک کہتا ہے۔ کارمن..... کارمن مجھے تمہارے دل سے' تمہارے دماغ سے' تمہاری روح سے عشق ہے' نک نے اتنی دنیا دیکھی ہے۔ اتنی حسین لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی ہے مگر اسے میری بدصورتی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔"

گرجا سے واپسی پر خلیج کے کنارے کنارے' سڑک پر چلتے ہوئے' وائی' ڈبلیو کے غم ناک ہال کے کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کارمن نے مجھے اپنی اور نک کی داستان سنائی۔ نک ڈاکٹر تھا۔ اور ہارٹ سرجری کی اعلیٰ ٹریننگ کے لیے باہر گیا ہوا تھا اور اسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔

رات کو میں مسز سوریل کے کمرے سے کارمن کے کمرے میں واپس آ چکی تھی کیوں کہ مسز سوریل اپنی لڑکی کو پکڑ لانے میں کامیاب ہو گئی تھیں اور لڑکی اب ان کے ساتھ مقیم تھی۔ سونے سے پہلے میں مچھردانی ٹھیک کر رہی تھی اور کارمن فرش پر آسن جمائے بیٹھی تھی۔

"نک....." اس نے کہنا شروع۔

"آج کل کہاں ہے؟" میں نے پوچھا

"معلوم نہیں۔"

"تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟"

"نہیں"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟" اس نے پوچھا

"یہ تو بہت لمبا چوڑا مسئلہ ہے۔" میں نے جمائی لے کر جواب دیا۔ "مگر یہ بتاؤ کہ تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟"

"ہاں" میں نے بحث کو مختصر کرنے کے لیے کہا۔

"اچھا تو تم خدا کو خط لکھتی ہو؟"

عمارت کی روشنیاں بجھ گئیں۔ رات کی ہوا میں آنگن کے درخت سرسرا رہے تھے۔ کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا سرخ پھولوں والا پردہ ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑائے جا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے ایک طرف سرکا دیا۔

"بہت خوبصورت پردہ ہے" میں نے پلنگ کی طرف لوٹتے ہوئے اظہار خیال کیا کارمن

فرش پر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ میری بات پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے آہستہ آہستہ شروع کیا۔" میں اور نک پہاڑی علاقہ میں کئی سو میل کی ڈرائیو کے لیے گئے تھے۔ سن رہی ہو؟"

"ہاں..... ہاں ....."

"راستے میں نک نے کہا کہ چلو ڈون ریموں سے ملتے چلیں۔ ڈون ریموں نک کے والد کے دوست اور کابینہ کے وزیر تھے۔ اور انہوں نے حال ہی میں اپنے ضلع کے پہاڑی مقام پر نئی کوٹھی بنوائی تھی۔ جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے نزدیک پہنچے تو سامنے سے سفید فراک پہنے بہت سی چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک اسکول سے نکل کر آتی دکھائی دیں۔ مجھے وہ منظر ایک خواب کی طرح یاد ہے۔

پھر ہم اندر گئے اور مسز ریموں کے انتظار میں ان کے شان دار ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ کیبنٹ منسٹر گھر پر موجود نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم اور اسٹڈی روم کے نزدیک جو دیوار تھی' اس میں شیشے کی ایک چوکور ڈبے ایسی کھڑکی میں پلاسٹک کی ایک بہت بڑی گڑیا سجی تھی جو کمرے کی نفیس آرائش کے مقابلے میں بہت بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ہم دونوں اس بد مذاقی پر چپکے سے مسکرائے پھر مسز ریموں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں ٹھنڈی چائے پلائی اور سارا گھر دکھلایا۔ ان کے غسل خانے سیاہ ٹائل کے تھے اور مہمان کمرے کے نفیس دیوان بیڈ سرخ پھول دار ٹیپسٹری (Tapestary) کے جھالروں والے غلاف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان پلنگوں کو دیکھ کر نک نے چپکے سے مجھ سے کہا تھا۔ "بد مذاقی کی انتہا" اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔ کوئی بد مذاقی نہیں۔ میں تو اپنے گھر کے لیے ایسے ہی پلنگ خریدوں گی اور اسی رنگ کے غلاف بنواؤں گی۔ اس کے بعد..... میں جب بھی گھریلو ساز و سامان کی دوکان سے گزرتی تو اس کپڑے کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک جاتے..... پھر میں نے تنخواہ بچا بچا کر اسی قیمتی کپڑے کا پردہ خرید لیا۔

"جب میں ایک مخصوص چینی ریستوران کے آگے سے گزرتی ہوں۔" وہ اسی آواز میں کہتی رہی "اور شیشے کے دریچے کے قریب رکھی ہوئی میز اور اس پر جلتا ہوا سبز لیمپ نظر آتا ہے تو میرا دل ڈوب سا جاتا ہے وہاں میں نے ایک شام کو نک کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔"

مجھے نیند آرہی تھی اور میں نک کے اس وظیفے سے اکتا چکی تھی۔ میں نے مچھردانی کے پردے گراتے ہوئے کہا..... "ایک بات بتاؤ..... تم کو اس قدر شدید عشق ہے اپنے نک سے تو تم نے اس سے شادی کیوں نہ کر لی۔ اب تک کیوں جھک مارتی رہیں۔"

"مجھے دس سال تک ایک دور افتادہ جزیرے میں اپنے بابا کے ساتھ رہنا پڑا' اس نے اداسی سے جواب دیا۔ "پہلے ہم لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں بمباری سے ہمارا چھوٹا سا مکان جل کر راکھ ہو گیا اور میری ماں اور دونوں بھائی مارے گئے۔ صرف میں اور میرے بابا زندہ بچے۔ بابا ایک اسکول میں سائنس ٹیچر تھے۔ ان کو ٹی۔ بی ہو گئی اور میں نے انہیں سینٹی ٹوریم میں داخل کرا دیا جو بہت دور کے جزیرے میں تھا..... سینی ٹوریم بہت مہنگا تھا۔ اس لیے کالج چھوڑتے ہی میں نے اسی صحت گاہ کے دفتر میں نوکری کر لی اور آس پاس کے دولت مند زمین داروں کے گھروں میں ٹیوشن بھی کرتی رہی مگر بابا کا علاج اور زیادہ مہنگا ہوتا گیا۔ تب میں نے اپنے گاؤں جاکر انناس کا آبائی باغیچہ رہن رکھ دیا۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے..... میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں کشتی میں بیٹھ کر جاتی اور زمین داروں کے محلوں میں ان کے کند ذہن بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تھک کر چور ہو جاتی تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ نک سے میری ملاقات آج سے دس سال قبل ایک فیسٹا (Fiesta) میں ہوئی تھی۔ اس دوران جب بھی دارالسلطنت آتی وہ مجھ سے ملتا رہتا۔ تین سال ہوئے اس نے شادی پر اصرار کیا لیکن بابا کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں ان کو مرتا چھوڑ کر یہاں نہ آ سکتی تھی۔ اسی زمانے میں نک کو باہر جانا پڑ گیا۔ جب بابا مر گئے تو میں یہاں آ گئی۔ اب میں یہاں ملازمت کر رہی ہوں اور اگلے سال یونیورسٹی میں اپنا مقالہ بھی داخل کر دوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ بابا کے کھیت بھی رہن سے چھوٹ جائیں۔ نک میری مدد کرنا چاہتا تھا مگر میں شادی سے پہلے ایک پیسہ نہیں لوں گی۔ اس کے خاندان والے بڑے بددماغ اور اکڑفوں والے لوگ ہیں۔ اور ایک لڑکی کے لیے اس کی عزت نفس بہت بڑی چیز ہے۔ عزت نفس' خود داری اور خود اعتمادی۔ اگر مجھے کبھی یہ احساس ہو جائے کہ نک مجھے حقیر سمجھتا ہے..... یا مجھے.....؟ سو گئیں..... اچھا..... گڈ نائٹ....."

دوسرے روز وہ صبح تیار ہو کر حسب معمول سب سے پہلے ناشتہ کی میز پر انتظام کے لیے پہنچ چکی تھی۔ مسز سوریل گام واپس جا رہی تھیں۔ اپنے ہونے والے داماد سے ان کی صلح ہو گئی تھی۔ وہ سویرے ہی آن پہنچا تھا۔ وہ ایک منحنی سا نوجوان تھا اور برآمدے کے ایک کونے میں بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا۔ فضاء پر عجیب سی بشاشت طاری تھی۔ لڑکیاں بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ میں بھی بہت مسرور تھی اور خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یہ ہلکے پھلکے اور مکمل پن کا احساس زندگی میں بہت کم آتا ہے اور صرف چند لمحے رہتا ہے۔ مگر وہ لمحے بہت

غنیمت ہیں۔

کارمن جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے دفتر چلی گئی۔ "آج بھی تم اپنے شان دار دوستوں سے ملنے نہ جا رہی ہوتیں تو جیپنی (Jeepaney) میں بٹھا کر شہر کے گلی کوچوں کو سیر کراتے۔" میگدیلنا نے مجھ سے کہا۔

"تمہارے لیے ایک کیڈی لک آئی ہے بھئی۔" روزا نے اندر آ کر اطلاع دی۔

"کیڈی لک..... افوہ.....!!" کورس ہوا۔

"تمہارے لیے ایسی چغادری موٹریں آتی ہیں کہ ہم لوگوں کی رعب کے مارے گھگھی بندھ جاتی ہے۔" برناڈا نے خوش دلی سے اضافہ کیا۔ میں نے لڑکیوں کو خدا حافظ کہا اور اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر آ گئی۔ میں سابق سفیر ڈون گارسیا ڈیل پریڈوس کے وہاں دو دن کے لیے ان کے ہل اسٹیشن جا رہی ہوں۔ ان کے وردی پوش شوفر نے سیاہ کیڈی کا دروازہ مودبانہ بند کیا اور کار شہر سے نکل کر سرسبز پہاڑوں کی سمت روانہ ہو گئی۔

پہاڑ کی ایک چوٹی پر ڈون گارسیا کا ہسپانوی وضع کا شان دار گھر درختوں میں چھپا دور سے نظر آیا تھا۔ وادیوں میں کہرہ منڈلا رہا تھا اور سفید اور کاسنی اور سرخ اور زرد رنگ کے پہاڑی پھول سارے میں کھلے ہوئے تھے۔ کار پھاٹک سے ہو کر پورچ میں رک گئی۔ قبائلی نسلوں والی شائستہ نوکرانیاں باہر نکلیں۔ بٹلر نے نیچے آ کر کار کا دروازہ کھولا۔ ہال کے دروازے میں ڈون گارسیا اور ان کی بیوی ڈونا ماریا میرے منتظر تھے۔ ان کا گھر سفید قالینوں اور سنہرے فرنیچر اور انتہائی قیمتی سامان آرائش سے سجا ہوا تھا۔ اور اس طرح کے کمرے تھے جن کی تصویریں لائف میگزین کے رنگین صفحات پر پریڈ فرنیچر یا انٹریر ڈیکوریشن کے سلسلے میں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

کچھ دیر بعد میں ڈونا ماریا کے ساتھ اوپر کی منزل پر گئی۔ وہاں شیشے والے برآمدے کے ایک کونے میں ایک نازک سی بید کی ٹوکری میں ایک چھ مہینے کی بے حد گلابی بچی پڑی غاؤں غاؤں کر رہی تھی۔ وہ بچی اس قدر پیاری تھی کہ میں ڈونا ماریا کی بات ادھوری چھوڑ کر سیدھی ٹوکری کے پاس چلی گئی۔ ایک بے حد حسین، صحت مند، تروتازہ اور کمسن امریکن نزدیک کے صوفے سے اٹھ کر میری جانب آئی اور مسکرا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"یہ میری بہو ہے" ڈونا ماریا نے کہا۔

"ہم تینوں ٹوکری کے گرد کھڑے ہو کر بچی سے لاڈ پیار میں مصروف ہو گئے۔ دوپہر کو لنچ کی میز پر امریکن لڑکی کا شوہر بھی آ گیا۔

"یہ ہمارا بیٹا ہوزے ہے۔" ڈون گارسیا نے کہا۔

ہوزے کی عمر تقریباً" پینتیس سال ہو گی۔ اپنی قومی کڑھت کی ہلکے آبی رنگ کی قمیض اور سفید پتلون میں وہ خاصہ وجیہہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نو عمر بیوی کو بے حد چاہتا تھا اور بچی پر عاشق تھا۔ زیادہ تر اسی کی باتیں کرتا رہا۔

رات کو میں اپنی بے حد پر تکلف اور بڑھیا خواب گاہ میں گئی جس کے ساز و سامان کو ہاتھ لگاتے فکر ہوتی تھی کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے وائی' ڈبلیو کے سیلے ہوئے کمرے اور تنگ مچھر دانی اور مسز سوریل اور ہال کی بد رنگ کرسیاں شدت سے یاد آئیں۔

دو دن بعد پریڈوس خاندان میرے ہی ساتھ دارالسلطنت واپس لوٹا۔

اپنے ماں باپ کو ان کے ٹاؤن ہاؤس میں اتارنے کے بعد ہوزے نے مجھے میری جائے قیام پر پہنچانے کے لیے کیڈلک دوبارہ اسٹارٹ کی۔ ہوزے اور اس کی بیوی ڈورتھی صرف دو ہفتہ قبل امریکہ سے لوٹے تھے۔ ان کا بہت سا سامان کسٹم ہاؤس میں پڑا تھا۔ جسے چھڑانے کے لیے انہیں جانا تھا۔

شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل کے سامنے ہوزے نے کار روک لی۔

"یہاں کیا کرنا ہے۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم یہیں ٹھہری ہونا؟"

"نہیں ڈیئر ہوزے میں وائی' ڈبلیو' سی' اے میں ٹھہری ہوں۔"

"وائی' ڈبلیو.....؟ گڈ گاڈ! کمال ہے اچھا وہیں چلتے ہیں۔ مگر کیا تم کو یہاں جگہ نہ مل سکی۔ تمہیں چاہیے تھا کہ آتے ہی ڈیڈی کو اطلاع دیتیں۔"

اس وقت مجھے دفعتاً" خیال آیا کہ میں ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی افتاد طبع کے ذریعہ کم از کم اپنی حد تک ذہنی طور پر ہموار کرتی چلی جاتی ہوں۔ مگر ہوزے اور اس کے والدین ملک کے دس دولت مند ترین خاندانوں میں شامل تھے۔ اور یہاں کے حکمران طبقے کے اہم ستون تھے۔ اور ان کو یہ سمجھانا بالکل بے کار تھا کہ مجھے وائی' ڈبلیو کیوں اتنا اچھا لگا ہے اور میں وہاں ٹھہرنے پر کیوں اس قدر مصر ہوں۔

ہوزے نے گلی کے نکڑ پر کار روک لی کیوں کہ چینیوں کی ایک قطار نے سارا راستہ گھیر رکھا تھا۔ میں جب وائی' ڈبلیو کے اندر پہنچی تو سب لوگ سو چکے تھے۔ میں چپکے سے جاکر اپنی مچھر دانی میں گھس گئی۔ کارمن حسب معمول فرش پر سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے سرہانے

سانتو طوماس (سینٹ طماس) کی تصویر پر گلی کے لیمپ کا مدھم عکس جھلملا رہا تھا۔

صبح چار بجے اٹھ کر میں دبے پاؤں چلتی شکستہ غسل خانے میں گئی اور آہستہ سے پانی کا نل کھول مگر پانی کی دھار اس زور سے نکلی کہ میں چونک اٹھی اسی طرح چپکے سے کمرے میں آ کر میں نے اسباب باندھا تاکہ آہٹ سے کارمن کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہ فرش سے غائب ہے اور کچھ دیر بعد اس نے آ کر کہا "ناشتہ تیار ہے۔" وہ ٹیکسی کے لیے فون بھی کر چکی تھی۔

"کیسا سفر رہا۔" اس نے چائے' انڈ ےملتے ہوئے کہا۔

"بہت دلچسپ۔"

"یہ تمہارے دوست لوگ کون تھے جہاں تم گئی تھیں؟ تم نے بتایا ہی نہیں۔"

میں بات شروع کرنے والی ہی تھی کہ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے جلدی سے کمرے میں جاکر سوٹ کیس کھولا۔ ایک نئی بناری ساری نکال کر ایک پرچے پر لکھا۔ "تمہاری شادی کے لیے میرا پیشگی تحفہ....." اور ساری اور پرچہ کارمن کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"ٹیکسی آ گئی" کارمن نے برآمدے میں سے آواز دی۔

ہم دونوں سامان اٹھا کر باہر آئے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی اتنے میں کارمن پھاٹک کی کھڑکی میں سے سر نکال کر چلائی....." ارے تم نے اپنا پتہ تو دیا ہی نہیں۔" میں نے کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا پتہ گھسیٹ کر اسے تھما دیا۔ پھر مجھے بھی ایک بے حد ضروری بات یاد آئی۔ "حد ہو گئی کارمن۔ تمہاری وائی' ڈبلیو نے مجھے اپنا بل نہیں دیا۔"

"بکو مت"

"ارے یہ تمہارا نجی گھر تو نہیں تھا۔"

"تم میری مہمان تھیں۔"

"بکو مت۔"

"تم خود مت بکو۔ اب بھاگو ورنہ ہوائی جہاز چھٹ جائے گا اور دیکھو جب میں شادی کا کارڈ بھیجوں تو تم کو آنا پڑے گا۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ ذرا سوچو تک تم سے مل کر کتنا خوش ہو گا۔"

مگر ہم دونوں کو معلوم تھا کہ میرا دوبارہ اتنی دور آنا بہت مشکل ہے۔

"خدا حافظ....." وہ کھڑکی میں سر نکال کر بہت دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی۔ ٹیکسی صبح

کاذب کے دھندلکے میں ایرپورٹ روانہ ہو گئی۔

ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ میں کسٹم کاؤنٹر پر سے لوٹی تو پیچھے سے ڈون گارسیا کی آواز آئی۔..... "نک..... میں ذرا سگار خرید لوں۔"

"بہت اچھا ڈیڈی....." یہ ہوزے کی آواز تھی۔

میں چونک کر پیچھے مڑی۔ ہوزے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ "دیکھا ہم لوگ کیسے ٹھیک وقت پر پہنچے۔"

"ہوزے....." میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا..... "تمہارا دوسرا نام کیا ہے۔؟"

"نک..... ڈیڈی جب بہت لاڈ میں آتے ہیں تو مجھے نک پکارتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر ہوزے ہی کہلاتا ہوں..... کیوں.....؟"

"کچھ نہیں....." میں اس کے ساتھ لاؤنج کی طرف چلنے لگی۔ "تم..... امریکہ کیا کرنے گئے تھے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہارٹ سرجری میں اسپیشلائیز کرنے..... میں نے تمہیں بتایا تو تھا کیوں.....؟"

"تم..... کبھی تم نے..... تم نے"

کیوں.....؟ کیا ہوا.....؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" میری آواز ڈوب گئی۔ لاؤڈ سپیکر نے دہرانا شروع کیا۔ "پین امریکن کے مسافر..... پین امریکن کے مسافر"

"ارے.....! روانگی کا وقت اتنی جلدی آ گیا؟" نک نے تعجب سے گھڑی دیکھی۔ ڈون گارسیا سگار خرید کر شفقت سے مسکراتے ہوئے میری طرف آئے۔ میں نے دونوں باپ بیٹوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور تیزی سے مسافروں کی قطار میں جا ملی۔

دوڑتے ہوئے طیارے کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا۔ ڈون گارسیا اور نک نیچے ریلنگ پر جھکے رومال ہلا رہے تھے۔ طیارے نے زمین سے بلند ہونا شروع کر دیا۔

یہاں سے بہت دور خطرناک طوفانوں میں گھرے ہوئے پوربی سمندر ہیں' ہرے بھرے جزیروں کا ایک جھنڈ ہے جو فلپائن کہلاتا ہے۔ اس کے جاگتے جگمگاتے دارالسلطنت منیلا کے ایک بے رنگ سے محلے کی ایک شکستہ عمارت کے اندر ایک بے حد چپٹی ناک اور فرشتے سے معصوم دل والی فلپینو لڑکی رہتی ہے۔ جو اپنے بچے کے لیے کھلونے جمع کر رہی ہے اور اپنے خدا کی واپسی کی منتظر ہے جس کی ذات پر اسے کامل یقین ہے۔

جگّا

بلونت سنگھ

ماجھا کے علاقہ میں بھیکن ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے' زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر رومان پرور ہوتی کہ سسی پنوں' سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہو جاتے تھے..... اور اب کے قرعہ گورنام کور کے نام پڑا تھا۔

گورنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کی مانند تھی' چینی کی مورت' چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقش قدم معدوم' سرمگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پرشباب دوشیزہ کی پرزور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پرسکون سے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی' وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی' ابھی اس میں پندار حسن پیدا نہ ہوا تھا' اس لئے جو شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبت کرتی ہے..... ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے اعلانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گزرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو

حالات خطرناک صورت اختیار کرلیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکر بلا دیا۔ اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا۔ "یہ تو نے بکرا کیوں بلایا ہے۔"

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ آخر کہاں تک؟ ایک دن خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا ٹکنہ اتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعوے دار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی' چاند جوبن پر تھا' گاؤں پر ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اروڑیوں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت' جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں' جی چاہتا چل دیتے' جی چاہتا ٹھہر جاتے' اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آ کر رکا' اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمول بات نہیں' مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرہ کی رگیں ابھری ہوئی' آنکھیں سرخ انگارہ' ناک جیسے عقاب کی چونچ' رنگ سیاہ چوڑے اور مضبوط جبڑے' سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو' جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی' جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ ڈاڑھی کے پاس لٹک رہے تھے' کانوں میں بڑے بڑے مندرے' کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر' بدن پر لانبا کرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا' گریبان کا تسمہ کھلا ہوا' اور اس کے سینہ کے گھنے بال نمایاں' اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھری۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے' اس نے جوتے اتارے' تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے کو پیچھے ہٹا پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا'

زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لئے گھڑا جھال کے نیچے کیا اس کی گوری کلائی پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یکجا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار' چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا' سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی' کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں' جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا' گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کولھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک نشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اولو سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لئے ہوئے اروڑی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے' کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اُپلا نیچے گرا دیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر' تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر آ رہے ہوں۔۔۔۔۔۔ لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا' شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا۔ مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں' یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سرخ سرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں' مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا۔ "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔"

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ بولی "گرنام!"

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے' بے بے' ویر' چاچا' باپو سب ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل۔" مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں' اس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا۔

"کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو کیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ "لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" مرد نے اجڈ پن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔ "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا' جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے' اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ممٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رک گیا اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا:

"واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

"واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔ "میں دور سے آ رہا ہوں' رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہر طرح سے خدمت کے....."

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے۔ اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے' سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہوگیا۔ ایک بچہ سینہ سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے موت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا ایک طرف کھرلی کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھس اور کھلی کی سانی کی بو ہر چار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس' دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیہ' یہ بڑے بڑے اپلے' کونے میں کپاس کی چھڑیاں' چولھے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار' ایک کمرہ میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اپلے جو جلانے کے کام میں آسکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چار خانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی..... اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری' ایک کٹورے میں شکر' گھی' ڈیلوں کا اچار' دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں' اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سر میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا' گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا۔ "گرنام! بس جا رہی ہو کیا؟"

گرنام حسب معمول اپنے دلفریب انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے

جھک کر آہستہ سے بولی۔ "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شریںہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیوؤں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لنڈمنڈ بیریوں پر چڑیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے' کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

اگے وچ کیلا اِی
نکل کے مل بابو!
ساڈا ونجھنے دا وادیلا اِی
نکل کے مل بابو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں' شلوار کے پائنچے اٹھائے' نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے' چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی' ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخرکار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی۔

"کیوں تم یہ زیوارت کہاں سے لائے ہو.....؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں' چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔" یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دابنے کو آ رہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"

گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی۔ "تم کتنے اچھے ہو..... یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لئے

لائے ہو گے نا؟"

"ہاں!"

گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لئے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں" گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے' ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔ "ہاں تم کالے ہو ذرا۔"

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسا مار دیا۔

مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لئے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی۔ "میں ان کو اپلوں میں چھپا دوں گی..... کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا۔ "گرنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا۔ "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں

کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا' جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اماں کھانس رہی ہے.... اب میں جاتی ہوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا۔ "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھنا لسی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔ "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"

اجنبی ہنس پڑا۔ "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا۔ "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں!" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھوی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو' اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل' غارت گری' ظلم' لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا۔ غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ اس کا دل پتھر' بازو آہن' غصہ قیامت' دہن شعلہ..... وہ قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لئے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے
چھویاں دے کل ٹٹ گئے..... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آ گیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ' جگے ماریا
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں آپے

اس کی طویل' تاریک اور ہیبت ناک شب حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کردیا' اور وہ تارا تھی۔۔ گرنام!

گرنام بیچاری نادان چھوکری' اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی' اس کے جذبہ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ دانستہ شکار کھیلے' سملوں کا تڑپنا دیکھے اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہیں جس کو زخمی کرنے کے لئے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں' اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا' وہی شاہیں اس کے تیر غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کرکے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدہ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے' اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی' وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے' وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اس کے اظہار محبت کرنے پر گرنام کیا رویہ اختیار کرے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہار نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی' اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کا سرنگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ :

جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا۔

جگا صبح و شام پاٹھ کرتا' غریبوں کو کھلاتا پلاتا' دان کرتا' گوردوارے میں جا کر سیوا کرتا' ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے' اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی توند والوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے

کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اوّل تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرا وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ مگے کو دنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

مگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی' اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروا لے' خواہ اسے یہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن بعد از غروب آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لئے گئی ہوئی تھی۔

مگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود ڈاڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔

دور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کوئی عورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام۔

جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ "میری تو گردن ٹوٹ گئی۔"

"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے مگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔

"اُپلے..... اور ہوتا کیا؟" گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ "آ رہی تھی' رستہ میں اُپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔"

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج مگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کئے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید

کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ "گرنام!" یہ کہتے کہتے رال اس کی ڈاڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا۔ "گرنام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلی سی شوخ اور الھڑ نہ رہی تھی مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ "کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں..... میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن....."

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی۔" گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ زیر مونچھ مسکرایا۔ "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گرنام چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا۔ "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے....."

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "نہیں گرنام، نہیں۔ جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہو گی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا.... ہاں تو.... مگر وہ ہے کون؟"

جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی..... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی۔ "تم ضرور میری مدد کرو گے' ان سب کے ہاتھوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام....."

جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے دلیپ..... دلیپ سنگھ"

جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔

اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے۔" گرنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ گرنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر جاؤ۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ۔" اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی' آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی..... معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا "..... دلیپ سنگھ؟....."

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی اور نہ چاند کی چاندنی۔ پل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو' انسان کو ہڑپ کر لینے کے لئے منہ کھولے بیٹھا ہو' یا جیسے کسی مردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن

کی پتلیاں کوّے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص ادھر سے گزرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔ نصف رات گزر چکی تھی۔ دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی۔ اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو، خوش وضع، مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران، آنکھیں شربت سے لبریز کٹورے، سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا۔ الغوزہ خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لئے جاتا ہے، اس واقعہ کو وارث شاہ کی ہیر سے بڑی درد ناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی..... اس نے ذرا بلند آواز میں "چھٹی" گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پل پر سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پل کے درمیان تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو..... اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پل کی دیوار پر سے اچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھوی پیچھے سے اس کی قمیض میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کرکے بلند آواز میں پوچھا۔

"ادھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا..... یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا۔ "مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تم کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا..... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلا تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے..... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔"

"بے شک میں وہی ہوں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نوعمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا..... اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں' اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں..... اور آج مجھ کو بارہواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس کے اجڈ پن پر تعجب ہوا۔ بولا "میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گرنام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی پل پر سخت زخمی کیا تھا..... آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا "..... اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے۔"

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔"

اجنبی نے گرج کر جواب دیا۔ "تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ" یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آ گئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا وہ ڈنڈا جو گدھے کے ہانکنے کے لئے ہاتھ میں لئے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اب کے کان پر رسید کی' ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا' اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا..... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھار چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی..... مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن

تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا۔

"اس طرح نہیں' دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا عین اصلی جگہ پر آ گیا.....

دلیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا'

"تیرے پاس چھوی ہے؟"

"نہیں!"

"تلوار ہے؟"

"نہیں!"

"صفا جنگ؟"

"نہیں!"

"مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا!" اجنبی نے پکار کر کہا "لاٹھی لے آ..... میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھا لی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہوا ہو ہوا ہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نو آموز اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین' جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھرکم' قوی ہیکل' کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلے جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا۔ "ایک!"

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا۔ "دو!"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا۔ "تین!" یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا۔ "او سنبھل بے چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔"

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیئے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا کر آگے کی طرف اچک کر اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا..... کچھ دیر تک مچلتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔ زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آور پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا' کان پر پگڑی پھاڑ کر باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کر کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد۔

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔ گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کھرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں' بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے

اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا۔

گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی باہر کھڑی ہے اور اسے جلدی واپس جانا ہے۔

چند لمحوں کے لئے اس نے سکوت کیا۔ پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا۔ "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی..... بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہو گی جس سے کہ میں چاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لئے وہ خاموش رہے۔

"..... اور وہ شخص یہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا..... اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہو گئی۔

گرنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہیے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا۔ "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گرنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے....."

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔

جگا بلند آواز میں بولا۔ "باپو! اماں!! بے بے!!! میں ان کی شادی کے لئے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔"

باپو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ گھڑ کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر بہادری سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔

پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیارداری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم کتنے اچھے ہو..... تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔"

قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی.....

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا' کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے' ان کی سجی سجائی سانڈنیاں' مردانہ اور دیوپیکر صورتیں' چمکتی ہوئی چھویاں..... عجب منظر پیش کرتی تھیں..... ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔ "باپو! وہ کون لوگ ہیں؟..... یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔"

"نہیں بیٹی نہیں' وہ دھرم سنگھ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا..... اور ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لئے جا رہا ہے۔"

رضو باجی

قاضی عبد الستار

سیتاپور میں تحصیل سدھولی' اپنی جھیلوں اور شکاریوں کے لیے مشہور تھی۔ اب جھیلوں میں دھان بویا جاتا ہے۔ بندوقیں بیچ کر پکیاں لگائی گئی ہیں' اور لائسنس پر ملے ہوئے کارتوس "بلیک" کر کے شیروانیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے قصبوں کا زنجیرہ پھیلا ہوا تھا۔ جن میں شیوخ آباد تھے۔ جو اپنے مغرور ماضی کی یاد میں ناموں کے آگے خاں لگاتے تھے اور ہر قسم کے شکار کے لیے غنڈے' کتے اور شکرے پالتے تھے۔ ان میں سارنگ پور کے بڑے بھیا رکھو چچا اور چھوٹے بھیا پاچو چچا بہت ممتاز تھے۔ میں نے رکھو چچا کا بڑھاپا دیکھا ہے۔ ان کے سفید ابروؤں کے نیچے سرمئی آنکھوں سے چنگاریاں اور کڑکتی آواز سے لپٹیں نکلتی تھیں۔ رضو باجی انہی رکھو چچا کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ میں نے لڑکپن میں رضو باجی کے حسن اور ان کے جہیز کے افسانے سنے تھے۔ جسے ان کی دو صاحب جائیداد مائیں جوڑ جوڑ کر مر گئیں تھیں۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں میراثیں اتنے تعلق سے ان کا ذکر کرتیں کہ ٹیڑھے نیچے لوگ بھی ان کی ڈیوڑھی پر منڈلانے لگتے۔ جب رضو باجی کی ماں مر گئیں اور رکھو چچا پر فالج گرا تو انہوں نے مجبور ہو کر ایک رشتہ قبول کر لیا۔ مگر رضو باجی پر عین منگنی کے دن جنات آ گئے اور رضو باجی کی ڈیوڑھی سے رشتوں کے "کاگا" ہمیشہ کے لیے اڑ گئے۔ جب رکھو چچا مر گئے تو پاچو چچا ان کے ساتھ تمام ہندوستان کی درس گاہوں کا پکیر مہ کرتے رہے لیکن جناتوں کو نہ جانا تھا نہ گئے۔ پھر رضو باجی کی عمر ایسا پیمانہ بن گئی جس کے قریب پہنچنے کے خوف سے سوکھی ہوئی کنواریاں لرز اٹھتیں۔ جب بھی رضو باجی کا ذکر ہوتا میرے وجود میں ایک ٹوٹا ہوا کانٹا کھٹکنے لگتا اور میں اپنی یادوں کے

کارواں کو کسی فرضی مصروفیت کے صحرا میں دھکیل دیتا۔ انہیں رضو باجی کا رجسٹری لفافہ ملا تو میں ایسا بدحواس ہوا کہ خط پھاڑ دیا لکھا تھا کہ وہ حج کرنے جا رہی ہیں اور میں فوراً سارنگ پور پہنچ جاؤں۔ لیکن اس طرح کہ گویا میں ان سے نہیں پاچو چچا سے ملنے آیا ہوں اور یہ بھی کہ میں خط پڑھ کر فوراً جلا دوں۔ میں نے رضو باجی کے ایک حکم کی فوراً تعمیل کر دی۔ خط کے شعلوں کے اس پار ایک دن چمک رہا تھا' پندرہ سال پہلے کا ایک دن جب میں بی۔اے میں پڑھتا تھا اور محرّم کرنے گھر آیا ہوا تھا۔

محرّم کی کوئی تاریخ تھی اور سارنگ پور کا سپاہی خبر لایا تھا کہ دوسرے دن میرکھ اسٹیشن پر شام کی گاڑی سے سواریاں اتریں گی۔ ہماری بستی کے محرّم سارے ضلع میں مشہور تھے۔ اور یہ مشہور محرّم ہمارے گھر سے وابستہ تھے اور دور دور سے عزیز و اقارب محرم دیکھنے آیا کرتے تھے۔ اور ہمارا گھر شادی کے گھروں کی طرح گھگھمانے لگتا۔ اس خبر نے میرے وجود میں قمقمے جلا دیئے۔ میں رضو باجی کو جن کی کہانیوں سے میرا تخیل آباد تھا پہلی بار دیکھنے والا تھا۔ عید کی چاند رات کی مانند وہ رات بڑی مشکل سے گزری اور صبح ہوتے ہی میں انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے اڈّھے جن کو پھرک اور لہڑو بھی کہتے ہیں' سنوارے گئے۔ بیل صابن سے نہلائے گئے۔ ان کو نئی اندھیریاں' سنگوٹیاں' اور ہمیلیں پہنائی گئیں۔ دھراؤ جھولیں اور پردے نکالے گئے۔ گھوڑے کے ایال تراشے گئے۔ زین پر پالش کی گئی اور سیاہ اطلس کا پھٹا باندھا گیا جو اس کے جسم پر پھوٹ نکلا' ساتھ جانے والے آدمیوں میں اپنی نئی قمیضیں بانٹ دیں اور جیب خرچ سے دھوتیاں خرید دیں اور دوپہر ہی سے کلف لگی برجس پر لانگ بوٹ پہن کر تیار ہو گیا اور دو بجتے بجتے سوار ہو گیا جبکہ چھ میل کا راستہ میرے گھوڑے کے لیے چالیس منٹ سے کسی طرح زیادہ نہ تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کو جو ہمارے تحائف سے زیر بار رہتا تھا اطلاع دی کہ ہمارے خاص مہمان آنے والے ہیں اور مسافر خانے کے پورے کمرے پر قبضہ جما لیا۔ گاڑی وقت پر آئی لیکن ایسی خوشی ہوئی جیسے کئی دن کے انتظار کے بعد آئی ہو۔ فرسٹ کلاس کے دروازے پر سارنگ پور کا مونوگرام لگائے ایک بوڑھا سپاہی کھڑا تھا۔ ڈبے سے مسافر خانے تک قناتیں لگا دی گئیں' آگے آگے پھوپی جان تھیں' ایک رشتے سے رکھو چچا ہمارے چچا تھے اور دوسرے رشتے سے ان کی بیوی ہماری پھوپھی تھیں ان کے پیچھے رضو باجی اور ان کے پیچھے عورتیں تھرماس اور پاندان اور صندوقچے اٹھائے ہوئے آ رہی تھیں۔ چائے کا انتظام تھا لیکن پھوپھی جان نے تیزی سے بلائیں لے کر انکار کر دیا اور فوراً اس اڈّھے پر سوار ہو گئیں جو تابوت کی طرح پردوں سے ڈھکا

ہوا تھا۔ رضو باجی بھی اس میں غروب ہو گئیں۔ جن کے ہاتھ سیاہ برقعے میں شعلے کی طرح تڑپ رہے تھے۔۔ دوسرے اڈّھوں میں عورتوں کو سامان کے ساتھ چڑھا دیا گیا' کھٹنا دیس کے سیاہ بیلوں پر میرا چھوٹا سا خالی اڈّھا اڑ رہا تھا۔ اور میں پھوپھی کے اڈّھے کے پہلو میں چھل بل دکھاتے ہوئے گھوڑے پر بھاگ رہا تھا۔ میں جو کبھی ہوائی بندوق ہاتھ میں لے کر نہ چلا تھا آج بارہ بور کی پچھیری اس امید پر لادے ہوئے تھا کہ اگر اڑتا ہوا طاؤس گرا لیا تو رضو باجی ضرور متاثر ہو جائیں گی۔ کچی سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے دھندہاری جنگل پر میری نگاہیں منڈلا رہی تھیں اور میں دعاء مانگ رہا تھا کہ کسی جھاڑی سے کوئی طاؤس اٹھے اور میں شکار کر لوں کہ پھوپھی جان کا اڈّھا رک گیا۔ میں گھوڑا چمکار کر قریب پہنچا آج سے زیادہ کبھی اس جانور کے نخرے بھلے نہ لگے تھے۔

"میرا تو اس تابوت میں دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رضو باجی کی آواز تھی جاڑوں کی صبح کی طرح صاف اور چمک دار!

"تو آپ میرے اڈّھے پر آ جایئے"

مگر اس پر پردہ کہاں ہے؟"

"میں ابھی بندھواتا ہوں۔"

پردہ بندھ رہا تھا کہ پھوپھی جان نے حکم دیا۔

کسی بوڑھے آدمی سے کہو ان کا اڈّھا ہانکے اور کسی عورت کو بٹھال دو۔"

"اڈّھا تو میں خود ہانکوں گا۔"

"ارے تو ..... اڈّھا ہانکے گا؟"

انہوں نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا اور میں گھوڑے سے پھاند پڑا۔ ساتھ ہی کسی سپاہی نے میری تائید کی۔

"ایسا ویسا ہانکت ہیں بھیا..... بیلن کی جان نکال لیت ہیں۔"

چادروں اور صافوں کا پردہ باندھ دیا گیا رضو باجی سوار ہوئیں اور بولیں "اس پر اتنی جگہ کہاں ہے کہ بوا بھی دھانس لی جائیں۔"

قبل اس کے کہ بوا اپنے اڈّھے سے اتریں میں نے بیل جڑوا دیے اور پینٹھ لے کر جوا پر بیٹھ گیا اور بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔ پھوپھی جان نے کچھ کہا لیکن پانچ جوڑ بیلوں کے گھنے گھنگھروؤں کی جھنکار میں ان کی بات ڈوب گئی۔ جب حواس کچھ درست ہوئے اور دماغ کچھ سوچنے پر

رضامند ہوا تو جیسے رضو باجی نے اپنے آپ سے کہا۔

"امی کے ادّھے کی ساری دھول ہم ہی کو پھانکنا ہے۔"

میں نے فوراً لیکھ بدل لی آدمی نے راسیں کھینچ کر مجھے نکل جانے دیا۔ ظالم بیلوں کو دوبارہ لیکھ پر لانے کے لیے میں نے ایک کے پینٹھ اور دوسرے کے ٹھوکر مار دی اور میری مہمیز اس کی ران میں چبھ گئی وہ تڑپا اور قابو سے نکل گیا اور اچانک رضو باجی کے ہاتھ میری کمر کے گرد آ گئے اور میرا بایاں شانہ ان کے چہرے کے لمس سے سلگ رہا تھا اور اعصاب میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔

"روکو"

انہوں نے مجھے پہلی بار حکم دیا میں نے سینے تک راسیں کھینچ لیں' بیل دلکی چلنے لگے میں نے جھانک کر دیکھا سانپ کی طرح رینگتی ہوئی سڑک پر دور تک درختوں کے سنتری کھڑے تھے اور ایک سپاہی میرے گھوڑے پر سوار سائے کی مانند میرے پیچھے لگا تھا۔ رضو باجی نے برقعے کا اوپری حصہ اتار دیا اور وہ سرخ بال جن پر ان کے حسن کی شہرت کا دارومدار تھا چہرے کے گرد پڑے دہک رہے تھے اور وہ ایک طرف کا پردہ اٹھا کر جنگل کی بہار دیکھ رہی تھیں' ان کے ہاتھوں کی قاتل گرفت نے ایک بار پھر میرے چٹکی لی اور میں نے بیلوں کو چھیڑ دیا اور ایک بار پھر ان کے سفید نرم ریشمی ہاتھ میری کمر کو نصیب ہو گئے۔ لیکن اب وہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں اور میں بیلوں کو پھٹکار رہا تھا اور ان کا سر میری پشت پر رکھا تھا اور میں اڑتی ہوئی ریشمی لپٹوں کو دیکھ سکتا تھا پھر وہ باغ نظر آنے لگے جن کے سائے سے آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ سڑک سے میرے گھر کا راستہ کبھی اتنی جلدی ختم نہیں ہوا اور اتنا دل کش نہیں معلوم ہوا۔ میں نے ادّھا روکا پردہ برابر کیا۔ سپاہی کو جوا پر بٹھا کر خود گھوڑے پر سوار ہوا۔ بستی میں بیل ہانکتے ہوئے داخل ہونا شایان شان نہیں تھا۔ رضو باجی مجھے دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں جب وہ اتر کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں تو میں نے پہلی بار ان کا سراپا دیکھا اور ان کے حسن کے سامنے میراثنوں کی تمام کہانیاں سچ معلوم ہوئیں۔ وہ مجھ سے تھوڑے دنوں بڑی تھیں لیکن جب انہوں نے میری پیٹھ پر سر رکھا اور ٹھنک کر کہا کہ گھر پہنچ کر اپنی بھابھی جان اور میری اماں سے میری مرمت کرائیں گی تو وہ مجھے بہت چھوٹی سی معلوم ہوئیں' جیسے میں نے ان کی گڑیاں نوچ کر پھینک دی ہوں اور وہ مجھے دھمکیاں دے رہی ہوں۔

میں محرّم میں سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات باہر گزارا کرتا تھا۔ اس سال باہر

جانے کا نام نہ لیتا تھا اور بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اندر منڈلایا کرتا تھا۔ نویں کی رات سال بھر میں واحد رات ہوتی تھی جب ہمارے گھر میں بیسیاں بستی میں زیارت کو نکلتی تھیں۔ پورا اہتمام کیا جاتا تھا کہ وہ پہچانی نہ جائیں۔ برقعوں کی بجائے وہ موٹی موٹی چادریں اوڑھ کر نکلتی تھیں، لیکن دور چلتے سپاہیوں کو دیکھ کر لوگ جان جاتے تھے اور عورتیں تک راستہ چھوڑ دیتی تھیں۔ جب رات ڈھلنے لگی اور سب لوگ سوتی چادریں اوڑھ کر یعنی بھیس بدل کر جانے کو تیار ہوئے تو پتہ چلا کہ رضو باجی سو گئی ہیں کسی نے جگایا تو پتہ چلا کہ سر میں درد ہے اور میں اٹھ کر باہر چلا آیا۔ جب بیبیوں کے پیچھے چلتے ہوئے سپاہیوں کی لاٹھیاں اور لالٹینیں پھاٹک سے نکلنے والی سڑک پر کھو گئیں تب میں اندر آیا۔ وہ دالان میں سیاہ کامدانی کے دوپٹے کا پلو سر پر ڈالے سو رہی تھیں۔ ایک عورت پنکھا جھل رہی تھی اور دوسری ان کی پائنتی پڑے کھٹولے پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے ان کی سفید گداز کلائی پر میٹھی سی چٹکی لی۔ انہوں نے منہ کھول دیا۔

"چلیے آپ کو تعزیے دکھا لاؤں۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا جسے انہوں نے عورتوں کو دیکھ کر جلدی سے چھڑا لیا اور کھڑی ہو گئیں۔

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"زیارت کی برکت سے دور ہو جائے گا۔"

میں نے بڑے جذبے سے کہا انہوں نے کپڑوں پر نگاہ کی۔

"اگر ان سے خراب کپڑے آپ کے پاس ہوں تو پہن لیجیے۔"

اور میں نے ان کے پلنگ سے چکن کی چادر اٹھا کر ان کے شانوں پر ڈال دی۔

اپنے تعزیے کے پاس بیٹھی ہوئی بھیڑ سے چند پاسی منتخب کیے۔ ان کو بندوق اور ٹارچ لینے کی ہدایت کی اور رضو باجی کو لیے ہوئے سڑک پر آ گیا۔ مجھے بیبیوں کے راستے معلوم تھے جو محرم کے جلوس کی طرح مقرر تھے اور میں مخالف سمت میں چل رہا تھا۔ کٹا ہوا چاند تہائی آسمان پر روشن تھا اور ہم بستی کے باہر نکل آئے تھے اور میں خود اپنے منصوبے سے لرز رہا تھا پھر وہ تالاب آ گیا جس کے پاس ٹیلے پر مندر کھڑا تھا اور سامنے املیوں کے دائرے میں لکھوری اینٹوں کا کنواں تھا۔ میں نے اپنے رومال سے پختہ جگہ صاف کی۔ نوخیز پاسیوں کو حکم دیا کہ وہ مندر کے اندر جا کر بیٹھ جائیں اب حد نگاہ تک دمکتے پانی اور آبادی کے دھندلے خطوط کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہمارے چاروں طرف املی کے درختوں کا گھنا سایہ پہرا دے رہا تھا۔ میں نے اپنا گلا صاف

کیا۔ ان کے پاس بیٹھ کر پہلی بار ان کو مخاطب کیا۔

"یہ کنواں دیکھ رہی ہیں آپ؟"

مجھے خود اپنی آواز بھیانک معلوم ہوئی۔

"یہ جناتوں کا کنواں ہے۔"

انہوں نے پوری شربتی آنکھوں کو کانوں تک کھول دیا اور میری طرف ذرا سا سرک آئیں۔

"اس میں جنات رہتے ہیں۔"

وہ میرے اور قریب آ گئیں ان کا زانو میرے جسم سے مس کرنے لگا' میں بھاٹوں کی طرح لاتعلق لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ جنات میرے ایک دادا کے شاگرد تھے۔ جب دادا میاں اس کنوئیں میں ڈوب کر مر گئے تو جناتوں نے یہاں اپنا بسیرا کر لیا۔" انہوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چادر ان کے شانوں سے ڈھلک گئی گھٹی گھٹی آواز میں بڑے کرب سے بولیں۔

"چلو..... یہاں سے بھاگ چلو۔"

ان کا سر میرے شانے پر ڈھلک آیا اور میں نے سرخ بالوں کی ریشمیں لپٹوں میں اپنے ہاتھ جلا لیے جن کے داغ آج بھی جلد کے نیچے محفوظ ہیں۔

"محرم کی اس رات کے آخری حصے میں جو شخص اس کنوئیں سے اپنے دل کی ایک مراد مانگتا ہے وہ پوری ہوتی ہے۔"

وہ مجھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں اور میں اس دنیا میں تھا جو پہلی بار میرے حواس نے دریافت کی تھی۔

"آپ ذرا دیر کے لیے چھوڑ دیجئے میں ایک دعاء مانگ لوں..... آج کے بعد پھر کبھی اس کنوئیں سے کوئی دعا نہ مانگوں گا۔"

وہ تڑپ کر اٹھیں اور مجھ کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی چلیں۔ جب پاسی کھڑے ہو گئے تب وہ مجھ سے الگ ہوئیں۔ سڑک پر آ کر مچل گئیں کہ گھر جاؤں گی میں ان کو بہلاتا ہوا امام باڑے کی طرف چلا۔ یہ امام باڑہ نواب نقی کی اس بہن نے بنوایا تھا جو واجد شاہ کی محل تھی آج بھی اس کی اولاد موجود ہے جو امام باڑے والیوں کے نام سے مشہور ہے اور یہ عمارت انہی کے عمل میں ہے یہاں کربلائے معلّٰی سے لائی ہوئی ضریح رکھی ہے۔ عورتیں اپنے بالوں کی ایک لٹ باندھ کر

مراد مانگتی ہیں جب مراد پوری ہو جاتی ہے تو اپنی لٹ کھول کر لے جاتی ہیں۔ ایک پاسی نے دوڑ کر امام باڑہ مردوں سے خالی کرا دیا پھاٹک میں عورتوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ بستی کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جب میرے گھر کا کوئی فرد کسی عورت کے ساتھ محرم دیکھنے نکلا ہو' زیارت کرنے نکلا ہو۔ دالان کے پاس آ کر ایک گدبدی سی لڑکی میرے جوتے کھولنے آئی۔ میں نے رضو باجی کی طرف اشارہ کر دیا وہ ان کے سینڈل کھولنے لگی جب میں اس ہال میں داخل ہونے لگا جس میں سونے کے پانی کی ضریح رکھی ہے تو وہی لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور بولی بٹیا صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ باہر ہی رہیں' اور میں باہر ہی کھڑا رہا۔ جب میں ان کے ساتھ امام باڑے سے نکل رہا تھا تو ان گنت مرد مجھے کنکھیوں سے گھور رہے تھے۔ عورتیں گھونگھٹ سے جھانک رہی تھیں اور میرے اعصاب کی کمان کھنچی ہوئی تھی کہ ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا!

"کون ہیں؟"

"بڑے بھیا کی دلہن ہیں۔"

اور میں لڑکھڑا گیا' رضو باجی کے سر سے چادر کا جھونپا ڈھلک گیا۔ جب سڑک ویران ہو گئی تو میں نے دیکھا رضو باجی کا چہرہ لمبی چوڑی مسکراہٹ سے روشن ہے۔ میں ان کے بالکل قریب ہو گیا۔

"آپ بہت خوش ہیں۔"

"اوں..... ہاں..... نہ مانگتے دیر نہ ملتے دیر۔"

اور میں اس جملے کے معنی سوچتا رہا۔

پھر ہمارے مقدر میں ایسی رات نہ لکھی گئی جو ان کے قرب سے مہک سکتی۔ ایک آدھ باران کی صورت دیکھنے کو ملی بھی تو اس طرح جیسے کوئی چاند دیکھ لے۔ اور جب میں سارنگ پور کی ڈیوڑھی پر یکّے سے اترا تو دیر تک کسی آدمی کی تلاش میں کھڑا رہا' دن دہاڑے وہاں ایسا سناٹا تھا' جیسے اس شان دار بوسیدہ عمارت میں آدمیوں کے بجائے روحیں آباد ہوں۔ میں دوہری ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور آواز دی۔

"میں اندر آجاؤں۔"

"آپ کون ہیں؟"

"میں چترہٹہ کا اجن ہوں۔"

"ارے..... آیئے..... بھیا آ جایئے۔"

بھاری پختہ صحن پر میرے جوتے گونج رہے تھے۔ بارہ دروں کے دہرے دالان کی اپنی محرابوں کے پیچھے لانبے لانبے کمروں کے اونچے اونچے دروازے کھلے تھے اور دوسری طرف کی عمارت نظر آ رہی تھی' کمرے میں قدم رکھتے ہی چونک پڑا یا ڈر گیا۔ دور تک پھیلے ہوئے سفید چوکے پر سفید کپڑے پہنے ہوئے رضو باجی کھڑی تھیں۔ چنا ہوا سفید دوپٹہ ان کے شانوں پر پڑا تھا اور سرخ و سفید بال ان کی پیٹھ پر ڈھیر تھے۔ وہ گردن گھمائے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اتری شام کی مدھم روشنی میں ان کے زرد چہرے کی سیاہ شکنیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ کانوں میں بیلے کے پھول اور ہاتھوں میں صرف گجرے پہنے تھیں۔ میں ان کی نگاہ کی ویرانی سے کانپ اٹھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے رہے۔ صدیاں گزر گئیں۔ کسی میں نہ پلک جھپکنے کی طاقت تھی۔ نہ زبان کھولنے کا حوصلہ۔ پھر جیسے وہ اپنی آواز کا سہارا لے کر تخت پر ڈھے گئیں۔

"تم ایسے ہو گئے..... اجن؟"

"بیٹھ جاؤ۔"

میں چوکے کے کونے پر ٹک گیا۔

"مجھے اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" مجھ پر جو گزری وہ اگر پتھروں پر گزرتی تو چور چور ہو جاتے۔ لیکن تم کو کیا ہو گیا؟ کیسے کالے دبلے کھٹا سے ہو گئے ہو۔ نوکر ہو نا..... اچھی بھلی تنخواہ پاتے ہو۔ زاہدہ جیسی بیوی ہے' پھول ایسے بچے ہیں' نہ قرض ہے نہ مقدمے بازی۔ تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا چپ کا روزہ رکھ لیا۔"

میں نے دل میں سوچا جناتوں کا سایہ ہے نا ان پر۔

"آپ نے پندرہ برس بعد روزہ توڑنے کو کہا بھی تو اس وقت کہ زبان ذائقہ بھول چکی اور معدہ قبول کرنے کی صلاحیت کھو چکا۔"

انہوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ وہ بوڑھی عورت میرے سوٹ کیس کے نیچے کچلی ہوئی آ رہی تھی' پھر پاچو چچا آ گئے۔ دبلے پتلے غمزدہ سے پاچو چچا جن کے شکار کی ایک زمانے میں دھوم تھی۔

رات کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں' جب رضو باجی اٹھ گئیں تو چچی جان نے سرگوشی میں کہا۔

"آج نو چندی جمعرات ہے۔ بٹیا پر جن کا سایہ ہے وہ آنے والے ہیں۔ تمہارا بستر اپنی طرف لگوایا تھا' لیکن بٹیا نے اٹھوا لیا' اگر ڈرنا تو آواز دے لینا یا چلے آنا' بیچ کا دروازہ کھلا رہتا

ہے۔

جمعرات کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر خاموش رہا۔ ان کے ہاتھ سے گلوریاں لے کر منہ میں دبائیں اور کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو تھپکتی رہیں۔ پاچو چچا مجھے بھیجنے آئے۔ دالان میں دو بستر لگے تھے۔ ان کے درمیان ایک کھٹولہ پڑا تھا۔ جس پر رضو باجی کی بوا ڈھیر تھیں۔ پاچو چچا مجھے صحن میں چھوڑ کر لالٹین لیے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ایک کالا جھبرا جھبرا سا کتا ایک طرف سے نکلا اور مجھے سونگھتا ہوا چلا گیا۔ پھر ایک دروازے سے رضو باجی نکلیں اور سارے میں مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ ان کے کپڑے نئے اور پھول تازے تھے۔ وہ بہت مصروف معلوم ہو رہی تھیں۔ بطخوں کے پرے آسمان پر شور مچاتے گزر رہے تھے۔ صحن میں اکتوبر کی چاندنی کا فرش تھا۔ برساتی میں پرانی کرسیوں پر بیٹھے ٹھنڈی سفید گاڑھی کافی پی رہے تھے اور گفتگو کے لیے الفاظ پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یہ جناتوں کا کیا قصہ ہے رضو باجی؟"

مجھے اپنی آواز پر حیرت ہوئی۔ میں نے یہ گولی کس طرح داغ دی تھی۔ انہوں نے پیالی رکھ دی۔ مسکرائیں۔ وہ پہلی مسکراہٹ عمر بھر کے غموں سے زیادہ غمزدہ تھی۔

"میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔"

"کاش آپ نے اس سے پہلے بلا لیا ہوتا۔"

"بیاہ کی طرح بے حیائی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے اجن..... دس برس پہلے کیا یہ ممکن تھا کہ تم اس طرح کھلے خزانے آدھی رات کو مجھ سے باتیں کر رہے ہوتے؟ آج تم گھربار والے ہو۔ میں کھوسٹ ہو گئی ہوں' اور چچی جان کا باورچی خانہ میری جائیداد سے روشن ہے..... خیر چھوڑو ان باتوں کو میں حج کرنے جا رہی ہوں اور حج کرنے والے ہر اس شخص سے معافی مانگتے ہیں جس کے ساتھ انہوں نے کوئی زیادتی کی ہو۔ تم کو معلوم ہے مجھ پر کب جنات آئے۔ آج سے دس سال پہلے' اور تم کو معلوم ہے تمہاری شادی کو کتنے برس ہوئے؟ دس سال! تم کو ان دونوں باتوں میں کوئی رشتہ نہیں معلوم ہوتا؟ تم نے چترہٹہ کے سفر میں کیا کیا؟ تم محرم کی نویں تاریخ کو مجھے کہاں کہاں گھسیٹتے پھرے؟ تم اس بھیانک کنوئیں سے میرے سامنے کیا مانگنا چاہتے تھے؟ تم نے عباسی علم کو بوسہ دے کر مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کسے پانے کی آرزو کی تھی؟ جاؤ اپنے امام باڑے کی ضریح کو غور سے دیکھو۔ میرے بالوں کی سرخ لٹ آج بھی بندھی نظر آئے گی۔ اگر کھچڑی نہ ہو گئی ہو۔ کیا میں نے امام حسین سے صرف ایک عدد

شوہر مانگنے کے لیے یہ جتن کیے تھے؟

سارنگ پور کی ناؤٹوں اور میراثنوں سے پوچھو کہ وہ رشتے لاتے لاتے تھک گئیں۔ لیکن میں انکار کرتے نہ تھکی۔ کیا تم مجھ سے یہ چاہتے تھے کہ میں سارنگ پور سے ستو باندھ کر چلوں اور چترہٹہ کی ڈیوڑھی پر دھونی رما کر بیٹھ جاؤں اور جب تم برآمد ہو تو اپنا آنچل پھیلا کر کہوں کہ حضور مجھ کو اپنے نکاح میں قبول کر لیں کہ زندگی سوارت ہو جائے' تم نے رکھو میاں کی بیٹی سے وہ بات چاہی جو رکھو میاں کی طوائفوں سے بھی ممکن نہ تھی۔"

"لیکن رضو باجی۔"

"مجھ پر جنات نہیں آتے ہیں! اجن میاں! میں جناتوں کو خود بلاتی ہوں اگر جنات نہ آتے تو کوئی دولھا آ چکا ہوتا اور تب اگر جناتوں کا کنواں' عباسی علم اور ضریح مبارک تینوں میرے دامن کو ایک مراد سے بھر دینے کی خواہش کرتے تو میں کیا کرتی؟ کس منہ سے کیا کہتی اس لیے میں نے یہ کھیل کھیلا تھا۔ اسی طرح جس طرح چترہٹہ میں تم مجھ سے کھیل رہے تھے۔ نہ اس میں تمہارے لیے کوئی حقیقت تھی اور نہ اس میں رضو کے لیے سچائی ہے۔ یہ حج میں اپنے باپ کے لیے کرنے جا رہی ہوں جو میرے بوجھ سے کچل کر مر گئے۔ جنہوں نے مرتے وقت بھی اپنی عقبیٰ کے لیے نہیں میری دنیا کے لیے دعا کی! اس لیے میں نے تم کو معاف کیا۔ تم اگر زاہدہ کو مجھ پر سوت بنا کر لے آتے تو بھی معاف کر دیتی۔

وہ نرکل کے درخت کی طرح لرز رہی تھیں۔ ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا ہوا تھا۔ دورنگی شال شانوں سے ڈھلک گئی تھی۔ سرخ بالوں میں برابر سے پروے ہوئے چاندی کے تار جگمگا رہے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی رائیگاں چلی گئی۔ جیسے میری بیوی نے مجھے اطلاع دی ہو کہ میرے بچے' میرے بچے نہیں ہیں۔

باہر کا آدمی

جوگندر پال

جب بھی مجھے خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے اس کا تھیلا گھومنے لگتا ہے' اس کے دائیں کندھے سے لٹکتا ہوا پھولا پھولا تھیلا' جس میں دنیا بھر کے..... لیکن ٹھہریئے' پہلے مجھے اس کا حلیہ بیان کرنا چاہیے..... اس کا چہرہ..... میری آنکھوں کے سامنے پھر اس کا تھیلا گھوم گیا ہے۔ دراصل اس کی ساری پہچان اسی تھیلے سے وابستہ ہے' شاید..... شاید اس کا کوئی چہرہ ہے ہی نہیں۔ بس آپ کسی بھی چہرے کے بارے میں سوچ لیجئے کہ یہی اس کا چہرہ ہے' پر اس چہرے پر داڑھی ضرور ہونی چاہیے' بڑی گھنی' بڑی سیاہ' منتشر داڑھی جسے دیکھ کر لگے کہ چہرے پر کوئی چہرہ نہیں داڑھی ہی داڑھی ہے..... آنکھیں؟..... اس کی آنکھیں اتنی چھوٹی ہیں کہ آپ غور سے نہ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے اسے آنکھوں کے بغیر ہی نظر آ جاتا ہو گا۔

جب بھی میں اس پارک میں آ نکلتا ہوں تو وہ سدا یہیں ہوتا ہے' نہ معلوم کہاں رہتا ہے' کیا کرتا ہے' کچھ کرتا بھی ہے یا نہیں' اور کچھ بھی نہیں کرتا تو اس کا تھیلا دنیا بھر کی اشیاء سے کیونکر بھرا رہتا ہے۔ ننھے منے بچوں کے لئے چاکلیٹ' خوبصورت عورتوں کے لئے پھول' ٹورسٹس کے لئے تصویریں' بیماروں کے لئے دوائیاں' شرابیوں کے لئے بائل او پنز' سب کچھ..... سب کے لئے سب کچھ' بغیر قیمت کے' بغیر احسان کے' صرف اس لیے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو جائے' بس!

ایک بار کسی عورت نے اس کا پھول قبول کرکے اسے پیسے ادا کرنا چاہے اور..... کیا نام ہے اس کا..... تھیلا..... میں اسے تھیلا ہی کہا کرتا ہوں'..... تھیلا روہانسا سا ہو کر رہ گیا۔

دس پیسے یا دس روپے دینا چاہتی ہو.... ہے نا.... پر میرا تھیلا اس
سے ایک پائی بھی وصول نہیں کرتا۔"

رت کے آدمی نے تھیلے کی جانب شک کی نظروں سے دیکھ کر اپنی بیوی کو آگے چاہا' لیکن اس کی بیوی نے بدستور رکے ہوئے بڑے پیار سے پھول اپنے جوڑے میں سجا

تھیلا خوشی سے اور پھولا پھولا معلوم ہونے لگا۔

"دیکھو بابو" اس نے عورت کے شوہر کو بتایا۔ "وہی جوڑا ہے لیکن میرے پھول سے کتنا رنگ دار نکل آیا ہے!"

"جاؤ' جاؤ بابا' کہہ دیا نا' اپنی راہ لو۔"

"تمہارا کیا لے رہا ہے ستی" اس کی بیوی نے اسے ٹوک دیا۔

"میں کسی سے کچھ نہیں لیتا' کیونکہ میرے تھیلے میں ہر چیز پہلے ہی سے موجود ہے.... جو چاہو لے لو۔"

تھیلے کو انبساط کا دورہ پڑ جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھڑے کھڑے چٹکیاں بجا بجا کر چھوٹے سے نیم دائرے میں ناچ رہا ہے.... "لے لو بھیا' سب کچھ لے لو' دھرتی میری ہے نہ اس کی' سب کچھ اپنا مان کے لو لو.... لے لو!"

جیسے کسی جھونپڑی میں کوئی غریب بچہ سو گیا ہو اور سپنا دیکھ رہا ہو کہ ان کے دروازے پر کہیں سے اناج کی گاڑی آ کر کھڑی ہوئی ہے اور وہ اچھل کر جوں کا توں سوئے سوئے دروازے پر آ گیا ہو۔

"لاؤ!"

"لے لو!"

تھیلا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ایک طرف نکل جاتا ہے' اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کی آواز کانوں میں پیہم بہتی رہتی ہے اور ہم اسے سن سن کر شاداب ہوتے رہتے ہیں۔

اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میں اس پارک میں یہاں اسی بنچ پر پڑا مغموم بیٹھا تھا۔ میرے پچاس روپے جیب سے کہیں گر گئے تھے' یا کسی نے نکال لیے تھے اور مہینہ ختم ہونے میں ابھی پورے بیس روز باقی تھے' اور ہمارے دفتر میں پیشگی تنخواہ ادا کرنے کا دستور نہ تھا اور اس اجنبی شہر میں میری جان پہچان کے بہت کم لوگ تھے۔

وہ ہنستا ہوا میرے پاس آ گیا۔

"کیوں پیارے؟ اتنے اداس کیوں بیٹھے ہو؟"

اس کی آواز کا اثر تھا یا میری ہمدردی کی تمنا' میں نے جھٹ اپنی ساری بپتا کھول کر بیان کر دی۔

تھیلے نے قہقہہ لگایا۔ "تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

تھیلے سے اس کا ہاتھ برآمد ہو کر میری طرف اس طرح بڑھا' گویا تیز ہوا سے اڑ اڑ کر کسی ثمر آفریں درخت کی ٹہنی۔ "یہ لو' تمہارے پچاس روپے!"

میں حیرت آمیز مسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"لے لو نا' تمہارے ہی ہیں!"

"تو یہ بات ہے۔" لیکن میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ تمہیں اب کیا لینا دینا ہے۔ تمہارے پیسے وصول ہو گئے ہیں' یہی بہت ہے۔ میری آنکھیں کئی روز دو باوردی سپاہیوں کے مانند اس کے تعاقب میں لگی رہیں۔ ہو نہ ہو' وہ ضرور کوئی ایسا ویسا دھندا کرتا ہے۔

پھر ایک روز

"بابا!"

وہ پارک کی ایک طرف جا رہا تھا کہ چند مشکوک قسم کے نوجوانوں نے اسے گھیر لیا۔

"لاؤ!"

تھیلے نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا؟ .... اور اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر تاش کا پیکٹ ان کی طرف بڑھا دیا اور وہ سب تاش کھیلنے کے لئے وہیں اس کے قدموں میں گھاس پر بیٹھ گئے اور وہ مسکرا مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

"آؤ بابا' تم بھی کھیلو۔ ہم پیسے لگا کر کھیل رہے ہیں۔"

"مجھے پیسوں سے کیا کرنا ہے بھائی؟"

"پیسوں سے کیا کیا جاتا ہے..... شراب پیو.... اور پلاؤ۔"

"مجھے جو کچھ پینا ہوتا ہے وہ پیسوں کے بغیر ہی پینے کو مل جاتا ہے.... ہاں' تمہیں پینا ہو تو....." اس کا ہاتھ شراب کی بوتل تھامے تھیلے سے نکلا۔ "یہ لو!"

"مفت؟"

"ہاں' لے لو' تمہاری ہی تو ہے۔"

تمہاری ہی تو ہے!..... تو..... تو اس کی ہر شے تمہاری ہی ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس نے واقعی میرے ہی پیسے مجھے لوٹائے تھے۔

"لے لو!"

میرے باوردی سپاہیوں کے ہاتھوں سے ہتھکڑی نیچے گر گئی اور کھٹکا پا کر تھیلے نے اپنا سر میری طرف موڑ لیا۔

"ارے تم؟..... آج پھر تو کسی نے جیب نہیں کاٹی؟"

میں خجل سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کچھ بولو بھئی، کہیں ایسا تو نہیں، کہ اب کے تم ہی کسی کی جیب کاٹ کے آ رہے ہو؟"

تاش کے پتے بانٹنے والے نوجوان نے قہقہہ لگا کر پہلی بار میری طرف سر اٹھا کر دیکھا۔

"اگر ایسا ہے تو آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ..... ہمارے مطلب کے آدمی ہو۔"

تھیلا پھر مجھے گورکھ دھندا سا معلوم ہونے لگا..... کیا پتہ..... کیا پتہ، وہ ان لوگوں کا گرو گھنٹال ہو؟

"ان سب لوگوں سے....." اسے مخاطب کرکے میں چند قدم پرے آ گیا تاکہ وہ بھی میری طرف سرک آئے..... "ان سب سے تمہاری بڑی گہری جان پہچان ہے؟"

"نہیں، میں کسی کو نہیں جانتا، تمہیں یا انہیں..... نہیں، تم ٹھیک کہتے ہو، میری شاید سبھی سے بہت گہری جان پہچان ہے....." اپنی بات پر وہ کان دھر کر ہنس پڑا۔ پتہ نہیں، میں کیا بک رہا ہوں..... اور پتہ نہیں مجھے تم پر غصہ کیوں آ رہا ہے؟" وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ سمجھدار لوگ مجھے بڑے بے وقوف لگتے ہیں۔" پھر وہ میری طرف دیکھے بغیر اپنے سامنے کی طرف چل دیا اور دیکھتے دیکھتے کچھ اس طرح گم ہو گیا گویا میری طرف پشت کیے میرے ذہن میں آ داخل ہوا ہو.....

اور وہ ساری رات میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور تھیلا بدستور میری طرف پشت کیے میرے ذہن میں چلتا رہا..... چلتا رہا اور وہیں کا وہیں دکھائی دیتا رہا اور میں بے چین سا پڑا رہا کہ وہ میری طرف منہ کرکے کھڑا کیوں نہیں ہو جاتا۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل میں اتر جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے سارے کا سارا تھیلا اٹھا کر باہر لے آؤں اور پھر اس میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک شے کو ٹٹول لوں کہ اس میں کیا کیا بھرا ہوا ہے؟..... اگر میں اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرتا تو آج کوئی سی، آئی، ڈی آفیسر ہوتا..... اوائل ہی سے مجھے ہر بات کی ٹوہ

لگانے کی پڑی رہتی ہے۔

میری طرف پیٹھ کئے تھیلا اپنی دھن میں چلا جا رہا ہے..... وہ! ..... اور وہ اس کے پیچھے۔

ٹھہرو! ..... یہ رکھ لو!..... میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔

پولیس!..... تھیلا ہنسنے لگا ہے..... تمہیں پولیس سے ڈر لگتا ہے..... ہاں' ہاں' خوب ڈرو..... جی بھر کے' تمہیں کوئی ڈاکو تھوڑا ہی بننا ہے۔ چور جتنا ڈر ڈر کر اپنا فرض پورا کرتا ہے اس کا کام اتنا ہی اچھا ہوتا ہے.....

جلدی کرو' پولیس.....

ہاں' ہاں سن لیا بھائی' لیکن تم جسے پولیس کہتے ہو وہ ہے کہاں؟..... کون؟ ..... ایک بار مجھے بھی شک گزرا کہ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس کے آگے آگے دوڑ کر میرا دم پھول گیا..... ہہ ہا ہہ!..... معاملہ دراصل ہوتا یہ ہے کہ چور بیچارہ خود آپ ہی اپنے پیچھے لگا رہتا ہے..... ہہ ہہ ہا! ..... چوری کر کر کے اس پر یہ راز افشا ہوتا ہے کہ اگر کبھی وہ گرفتار ہوا تو اپنے ہی ہاتھوں ہو گا..... ہہ - ہہ ہا! ..... تھیلے کی داڑھی میں سے اس کے چہرے کے چھپے ہوئے نقوش اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے اس کے تھیلے میں اوپر تک ٹھنسا ہوا مال..... "پولیس سے کیا ڈر؟..... ڈرنا ہی ہے تو اپنے آپ سے ڈرو' اپنی ذات کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دو' پھر تمہیں کسی سے..... پولیس سے بھی کوئی خطرہ لاحق نہیں....."

میں نے اپنے بستر پر بے چینی سے پہلو بدلا' شاید میں سو گیا تھا اور..... اور میری آنکھیں کھلی تھیں اور..... تھیلا میرے سامنے ہوا میں جھولتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ "تمہیں جو کچھ بھی چاہیے بلا جھجک کہہ دو۔ میرے پاس سب کچھ ہے اور میرا سب کچھ تمہارا ہے' میرا نہیں' چور بے چارے کا مال اپنا کہاں' میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے' بولو' تمہیں کیا چاہیے۔"

میں آپ کو سچ بتاؤں؟..... میں نے بھی ایک بار چوری کی تھی۔ ان دنوں میں ایک بزنس مین کا سیکرٹری تھا۔ جب اسے خبر ملی کہ اس کے گھر کالے دھندے کے شک میں این فورس منٹ والے چھاپہ مارنے کی سوچ رہے ہیں تو اس نے گھر کی نقدی ادھر ادھر اوروں کے گھر رکھوا دی۔ مجھے بھی اس نے پانچ ہزار رکھنے کو دیا۔ پر دو روز بعد میں نے تھانے میں جھوٹی رپورٹ کر دی کہ میرا ڈھائی ہزار روپیہ چوری ہو گیا ہے..... اور ڈھائی ہزار لے کر کانپتا ہوا' مالک کے پاس جا پہنچا..... اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنا مجھ غریب کے بس سے باہر ہے جناب' آپ اپنی پوری رقم

تھوڑی تھوڑی کرکے میری تنخواہ سے کاٹ لیا کریں۔ میرا مالک میری ایمانداری سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے دو چار مہینے پچاس پچاس روپے کاٹ کر باقی کی رقم مجھے معاف کر دی..... آپ یقین کیجئے ان مفت کے ڈھائی ہزار نے مجھے چند ماہ کے لئے اتنا شاہ دل بنا دیا کہ کسی جان پہچان والے کو مشکل میں پا کر مجھے بڑی مسرت ہوتی اور بڑی مشکل سے اسے مدد قبول کرنے پر آمادہ کرتا..... لو بھائی' یہ تمہارے ہی ہیں!..... ایک نہایت غریب اور بوڑھے ہمسائے کو تو میں نے بیک وقت پانچ سو روپے دے دیئے..... لو چاچا' روؤ نہیں' ان پیسوں سے ہنسی خوشی اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دو۔ اب یہ قصہ لے ہی بیٹھا ہوں تو باقی قصہ بھی سن لیجئے۔ بوڑھے کی بیٹی کو پتہ چلا تو اسی روز شام ڈھلتے ہی وہ سب سے چھپ کر میرے پاس آ گئی اور میرے سینے سے سر جوڑ کر جی بھر کے روئی اور میں نے..... اب کیسے بتاؤں میں بڑا برا آدمی ہوں..... چلئے چھوڑیئے' یہی کیا کم ہے کہ غریب کا کام ہو گیا۔

میں نے بے چین ہو کر بستر پر پھر پہلو بدلا۔

پھولے ہوئے تھیلے کا سامنے کا اوپری حصہ بڑی گھنی اور بے ترتیب داڑھی مونچھ سے بھر گیا ہے۔ گھاس پھوس کے اس تودے کے نیچے سے مجھے کسی کی آواز سنائی دی ہے۔ ارے! یہ تو میری ہی آواز ہے' یا میری نہیں تو آپ کی' یا کسی اور کی' کسی کی بھی....." کہیں سے مجھے ایک ہزار ہاتھ آ جائے تو اسی وقت ایک سو روپے یتیم خانے میں دے آؤں اور پانچ ہزار آئے تو ڈھائی ہزار..... دس ہزار تو آٹھ..... ہاں' خدا کی قسم' آٹھ ہزار..... میرے لیے دو ہی کافی ہیں..... اور پچاس ہزار آ جائے تو خوشی سے باؤلا ہو کر یہ سارے کے سارے پیسے کسی کی مٹھی میں تھما دوں اور ننگے پاؤں دوڑتا ہوا جنگل کی طرف نکل جاؤں....."

اپنے بستر پر لیٹے لیٹے میں بے تابی سے ہنس پڑا۔

تمہیں یقین نہیں آ رہا؟..... نہ سہی..... پر تمہیں معلوم نہیں' چور کتنا نیک ہوتا ہے۔ چرا چرا کر نیکی کا ڈھیر جمع کر لیتا ہے لیکن چوری کا مال ہوتا ہے اس لیے اپنی نیکی کو اس طرح خرچ کرتا ہے کہ اس پر نیکی کا گمان نہ ہو' اس کی چوری پکڑی نہ جائے....."

شاید میری آنکھ لگ گئی تھی' یا اگر پہلے ہی آنکھ لگی ہوئی تھی تو نیند ہی نیند میں تھک کر میں خوابیدہ ہونے لگا تھا۔

دوسرے روز شام کے وقت..... ذرا دھیان سے سنئے' اصل میں یہی واقعہ سنانے کے لئے میں نے ساری کہانی چھیڑی ہے..... شام کے وقت تھیلے سے ملتے ہی میں نے بڑے اچانک پن

سے' بڑی محبت سے یہ سوال کیا..... "تم کام وام کیا کرتے ہو؟"

میرا سوال سن کر اس کی آنکھوں میں چھپا ہوا کالا چور ابھر آیا اور مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ یہ کالا چور دیکھتے ہی دیکھتے میرا گلا گھونٹ دے گا لیکن عین اس وقت پولیس کا ایک سپاہی کہیں سے وارد ہو گیا۔

"کہو بھیا' بیڑی پیو گے؟" دفعتاً" تھیلے کے چہرے میں درویش صورت مسکراہٹوں کا ہجوم امنڈ آیا اور اس کا ہاتھ بیڑی کا ایک بنڈل لیے تھیلے سے نکلا' مانو اس نے خالی خولی ہوا میں ہاتھ ڈال کر معجزے کا سماں باندھ دیا..... "لے لو نا!"..... تمہارا ہی ہے!!"

لیکن اس اثناء میں پولیس کے تین سپاہی اور آ گئے اور اسے گھیر لیا۔

درویش صورت مسکراہٹوں کے ہجوم سے گرد اڑنے لگی۔ "گھبراؤ نہیں' میرے تھیلے میں سب کچھ ہے..... سب کچھ تمہارا ہی ہے..... جو چاہو گے دے دوں گا۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو چپکے سے ہمارے حوالے کر دو۔"

"ہاں' ہاں' ضرور....." تھیلے نے ہاتھ اپنے تھیلے میں ڈالا اور ساری اشیاء کو ٹٹولتے ہوئے یکبارگی اس کا چہرہ اترنے لگا..... "میں..... میں تو اپنے تھیلے میں نہیں ہوں.....!"

اور پھر اپنی بات کو سن کر وہ ہنسی نہ روک سکا اور سرعت سے عقب کی خاردار جھاڑیوں کی طرف اچھل گیا اور چور نہ ہوتا تو ضرور پکڑا جاتا!

ہزاروں سال لمبی رات

رتن سنگھ

سننے والے اس کی بات بڑے انہماک سے سن رہے تھے حالانکہ سنانے والا جوان سب کے بیچ لیٹا ہوا تھا' بالکل اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا۔ ان میں کہیں کوئی تسلسل نہیں تھا۔ بات کرتا کرتا وہ خود ہی بہک جاتا جیسے راہ چلتا مسافر اپنی راہ سے بھٹک کر کسی غلط راستے پر چلنے لگے۔ ایک بات ادھوری ہی چھوڑ کر وہ کسی دوسری بات کا سرا پکڑ لیتا۔ اس طرح رات بہت دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

وہ سب کے سب ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والے بازار کی ایک دوکان کے برآمدے میں آکر رات کاٹنے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب ان میں سے سب سے بوڑھے آدمی نے گلا صاف کرتے ہوئے کسی راجہ کی بات شروع کی تو اس برآمدے میں لیٹے ہوئے سب کے سب آدمی ہنکاری بھرنے لگے۔ "ہوں' پھر کیا ہوا بابا۔"

بس پھر کیا تھا بات چل نکلی.....

ایک بادشاہ تھا اس کی سات رانیاں تھیں۔

ساتوں رانیوں کے لیے بادشاہ نے الگ الگ محل بنوائے۔ ایک لکڑی کا' دوسرا اینٹ گارے کا' تیسرا سنگ مرمر کا' چوتھا تانبے کا' پانچواں چاندی کا' چھٹا سونے کا اور ساتویں میں ہیرے جواہرات جڑے تھے۔

"بالکل ٹھیک۔" کسی نے ہنکاری بھری۔

اتنی دولت ہونے پر بھی بادشاہ کے یہاں اولاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ بہت دکھی تھا۔ بادشاہ کو آخر کسی نے رائے دی کہ فلاں جنگل میں ایک پیڑ ہے اس پر سات پھل لگے ہیں۔ اگر

بادشاہ پھلوں کو توڑ کر اپنی رانیوں کو کھلائے تو سب کے اولاد ہو جائے گی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس پیڑ تک پہنچنا بڑا مشکل تھا۔ راستے میں سات دریا پڑتے تھے اور سات دیوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور پیڑ کے گرد سات سانپوں کا زبردست پہرہ تھا۔ لیکن بادشاہ بھی اپنی دھن کا پکا تھا وہ اپنا لاؤ لشکر لے کر چل پڑا۔ بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ بوڑھے کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ جب اس کی سانس درست ہوئی تو بوڑھا بھک گیا۔ اس نے ایک دوسری بات چلا دی۔

بڑی پرانی بات ہے۔ ایک کاریگر نے ایک ایسا ڈنڈا بنایا جس کے اندر ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔ اس طرح وہ ڈنڈا آدمیوں کی طرح ہی بولتا تھا' چلتا تھا اور کھاتا پیتا تھا۔

"ٹھیک۔ ٹھیک" قریب قریب سب نے مل کر ہنکارا بھرا۔

پھر اچانک یہ ہوا کہ رکشوں اور تانگوں کا ریلہ شور مچاتا ہوا سڑک پر سے گزرنے لگا۔ شاید اسٹیشن پر کوئی مسافر گاڑی رکی تھی۔ اس لیے بوڑھا تھوڑی دیر رکا۔ پھر اس نے ایک مچھلی کی بات شروع کر دی جو اتنی بڑی تھی کہ اس کی پیٹھ پر باقاعدہ ایک شہر بسا ہوا تھا۔ جس پر نہ معلوم کتنے ہی مکان بنے ہوئے تھے کتنے ہی کھیت تھے۔ سمندر میں جس طرف یہ مچھلی جاتی اس طرف یہ بسا بسایا شہر چلا جاتا۔

"بالکل ٹھیک" سب نے ہنکاری بھری۔

اس طرح رات نہایت آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی بوڑھا باتیں کیے جا رہا تھا اور وہ سب کے سب بڑے غور سے سن رہے تھے۔ پھر کسی بات کو ادھوری ہی چھوڑ کر بوڑھے نے ایک نئی بات شروع کی۔

ہزاروں سال پہلے کی بات ہے ایک بادشاہ نے آدھی دنیا فتح کر لی۔

"پھر"

پھر اس خوشی میں بادشاہ نے ایک بہت بڑی دعوت دی۔

"پھر۔" "پھر"

پھر کیا اتنا کھانا بنایا گیا کہ بادشاہ کے شہر کے سارے کے سارے مکانوں میں کھانا بنا بنا کر رکھا گیا۔

"پھر۔ پھر۔ پھر" سبھی آدمی ایک ساتھ ہنکاری بھر رہے تھے۔

بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

"سب سے پہلے بادشاہ اور اس کے رشتہ داروں نے کھانا کھایا۔"

"ٹھیک۔"

"پھر بادشاہ کے سینکڑوں امیروں وزیروں نے کھانا کھایا۔

"ٹھیک"

پھر بادشاہ کے ہزاروں فوجیوں اور چنے ہوئے شہریوں نے کھانا کھایا۔

"ٹھیک۔"

"اتنے لوگوں کو کھانا کھاتے کھاتے رات ہوگئی۔"

"ٹھیک"

"اور سب کے بعد رات کے وقت لاکھوں غریب غرباء اور فقیروں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔"

"بالکل جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔" اس برآمدے میں لیٹے ہوئے سبھی آدمی احتجاجاً اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں ایک آدمی بولا "بوڑھے تجھے جھوٹی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔ اگر ہم نے رات کو پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہوتا تو اس وقت چین کی نیند نہ سوئے ہوتے۔ رات بھر تمہاری یہ بکواس کون سنتا؟"

"ارے بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو۔" بوڑھے نے کچھ سہمی ہوئی آواز میں کہا "میں بھی تمہاری طرح بھوکا ہوں۔ اگر مجھے بھی نیند آ رہی ہوتی تو یہ باتیں کرنے کے لیے جاگتا ہوتا۔ میں بھی..... تو سوجاتا۔"

رونے کی آواز

سریندر پرکاش

فلاور انڈر ٹری از فری

سامنے والی کرسی پر بیٹھا ابھی ابھی وہ گا رہا تھا۔ مگر اب کرسی کی سیٹ پر اس کے جسم کے دباؤ کا نشان ہی باقی ہے۔ کتنا اچھا گاتا ہے وہ..... مجھے مغربی موسیقی اور شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی تو نہیں ہے۔ مگر وہ کم بخت گاتا ہی کچھ اس طرح ہے کہ میں کھو سا جاتا ہوں۔ وہ گاتا رہا اور میں سوچتا رہا "کیا پھول درخت کے سائے تلے واقعی آزاد ہیں؟"

وہ اب جا چکا ہے۔ جن سُروں میں وہ گا رہا تھا وہ اپنی گونج کھو چکے ہیں۔ مگر الفاظ سے میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔

فلاور انڈر ٹری از فری

اس سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ الفاظ کی عمر سُر سے لمبی ہوتی ہے۔ شام، جب وہ مجھ سے ملا خاصہ نشے میں تھا۔ طالب علموں کے ایک گروہ نے دن میں اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کے ملک کے گیت اس سے سنتے رہے اور شراب پلاتے رہے۔ میرے کندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مجھے سارے دن کا قصہ سنایا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "گھر سے جب نکلا تھا تو میرے ذہن میں یہ فتور تھا کہ ساری دنیا پیدل گھوم کر اپنا ہم شکل تلاش کروں گا۔ آٹھ برس ہونے کو آئے مجھے دوسروں کے ہم شکل تو ملتے رہے مگر اپنا ہم شکل اب تک نہیں ملا۔"

"کیا کہیں تمہیں کوئی میرا ہم شکل ملا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں! سیکنڈی نیویا میں!"..... اس نے میری طرف دیکھے بغیر اور اپنے ذہن پر زور دیئے

بغیر جواب دیا۔

رات گئے تک ہم سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ جب تھک گئے تو گھر کا رخ کیا وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کرسی پر بیٹھا دو ایک منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک دم اپنا مخصوص گیت گانا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا "اس گیت میں جو الفاظ ہیں ان کے معنی کیا ہیں؟"

"معنی کوئی ساتھ نہیں دیتا' صرف الفاظ دیتے ہیں۔ دیتے بھی کیا ہیں۔ بس اپنے معانی کی مہر ثبت کر دیتے ہیں اور ہم ان میں سے اپنے معنی تلاش کرتے ہیں!" اس نے جواب دیا۔

کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس نے کمرے کی بے ترتیبی کا جائزہ لیا اور پھر اچانک بول اٹھا۔ "تم شادی کیوں نہیں کر لیتے اچھے خاصے معمولی آدمی ہو۔" میں بوکھلا سا گیا۔

"بات دراصل یہ ہے۔" میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "ہماری بلڈنگ کی اوپر والی منزل میں ایک وشنو بابو رہتے ہیں' وہ اس بلڈنگ کے مالک بھی ہیں ہم سب ان کے کرایہ دار ہیں۔ بہت سال پہلے جب وہ بالکل معمولی آدمی تھے تو انہوں نے ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس کا نام "سرسوتی" ہے۔ پھر اچانک وشنو بابو ایک مال دار عورت لکشمی سے ٹکرا گئے۔ تب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے "لکشمی" سے اپنا دوسرا بیاہ رچا لیا۔ اب لکشمی اور وشنو دونوں آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں اور بے چاری سرسوتی رات رات بھر سیڑھیوں میں بیٹھی روتی رہتی ہے۔ اسی ہنگامے کی وجہ سے میں ابھی طے نہیں کر پایا کہ مجھے کسی سرسوتی سے شادی کرنی چاہیے یا کسی لکشمی سے؟"

اس نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا' اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہے تھے۔ پھر اس نے ایک دم سے گڈ نائٹ! کہا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ اپنی اسی طرح کی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے وہ کبھی کبھی مجھے گوشت پوست کے آدمی کی بجائے کوئی خیال لگتا ہے جو سمندر پار سے یہاں آ گیا ہو۔

جس عمارت کے ایک کمرے میں' میں رہتا ہوں۔ اس کے سب کمروں کی دیواریں کہیں کہیں' جیسے تیسے ایک دوسرے سے مشترک ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک کمرے کے اندر کی آواز یا خاموشی دوسرے کمرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں' میری آواز یا خاموشی یا پھر چند لمحے پہلے کمرے میں گونجنے والی اس کے گانے کی آواز بھی کہیں نہ کہیں ضرور پہنچی ہو گی۔

باہر شاید رات نے صبح کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔ اردگرد کے سب گھروں کی

بتیاں بجھ گئی ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے اور خاموشی دیمک کی طرح آہستہ آہستہ سب طرف رینگنے جا رہی ہے۔ میں دروازے کی چٹخنی چڑھا کر اور مدھم بتی جلا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوں۔

مدھم روشنی میں سفید چادر میں لپٹا ہوا اپنا جسم مجھے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کی طرح لگتا ہے۔ تنہائی' خاموشی اور تاریکی میں ایسا خیال خوف زدہ کر ہی دیتا ہے۔ جیسے خواب میں بلندی سے گرتے ہوئے آدمی کا جسم اور ذہن سن ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی میری کیفیت ہے۔ دھیرے دھیرے میں نیچے گر رہا ہوں اور پھر اچانک مجھے لگتا ہے میں اپنے جسم میں واپس آ گیا ہوں۔

باہر سے کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ شاید سرسوتی اور لکشمی میں پھر جھگڑا ہوا ہے اور سرسوتی کے رونے کی آواز سیڑھی سیڑھی اتر کر نیچے میرے کمرے کے دروازے تک آ گئی ہے' مگر یہ تو کسی بچے کے رونے کی آواز ہے! میں محسوس کرتا ہوں..... ٹھیک ہے پڑوس والوں کا بچہ اچانک بھوک کی وجہ سے رونے لگ گیا ہو گا اور اس کی ماں بدستور نیند میں بے خبر سو رہی ہو گی یا پھر شاید ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر گئی ہو اور بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو۔ آواز آہستہ آہستہ قریب ہو کر واضح ہوتی جا رہی ہے۔ پھر مجھے لگتا ہے ایک بچہ میرے ہی پہلو میں پڑا رو رہا ہے اور کفن میں لپٹی ہوئی میری لاش میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی ہے۔

"اگر درخت تہذیب کی علامت ہے تو ہم اس کے سائے میں روتے ہوئے آزاد پھول ہیں۔" میرے ذہن میں اچانک اس کے الفاظ کے معنی کھل اٹھے ہیں۔ جن کے سرورہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بچہ بدستور رو رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز میں درد اور دکھ کی لہریں شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مگر اسے یہ کس نے بتایا ہو گا؟ اس کے باپ نے؟ مگر وہ تو بدستور سو رہا ہے۔ کیونکہ اس کی آواز میں اس کے باپ کی آواز بھی شامل نہیں ہوئی۔ یہ تو ہر کسی کو آپ ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مجھے بھی پتہ چل گیا تھا!..... بچے کے رونے کی آواز میری آواز سے کتنی ملتی جلتی ہے....!

پھر اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "اچھے خاصے معمولی آدمی ہو۔"

میں واقعی معمولی آدمی ہوں۔ ہر صبح اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلتا ہوں۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہتا ہوں۔ سورج کی طرف منہ کر کے دن بھر بھاگتا رہتا ہوں اور رات ہونے پر اپنے آپ کو گھر کے دروازے پر کھڑا پاتا ہوں۔

صبح سب سے پہلے سارس کی طرح اڑتا ہوا میں اس عمارت تک جاتا ہوں۔ جہاں ایک

عورت خوب صورت کیبن میں گلاس ٹاپ کی میز پر اپنی سفید مرمریں بانہیں پھیلائے گھومنے والی کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ اپنے سفید بالوں کو ہر روز رنگ کے خضاب سے رنگ کر آتی ہے۔ میز پر پھیلی ہوئی اس کی بانہیں ..... اس طرح لگتی ہیں جیسے کسی عورت کی برہنہ ٹانگیں ہوں۔

کیبن کے اردگرد سے کئی سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اس کیبن کے شیشوں میں سے اکثر جھانکتا ہوں اور سوچتا ہوں اگر واقعی وہ اپنی ننگی ٹانگیں میز پر پھیلائے ہوئے ہے تو.....

.....! سیڑھیاں جہاں سے شروع ہوتی ہیں' وہاں داہنے طرف ایک بڑی سی الماری لگی ہوئی ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے بنک کے لاکروں جیسے کئی خانے بنے ہوئے ہیں جن میں ہر آدمی اپنی ذاتی چیزیں رکھ سکتا ہے۔ مگر میں ہر روز اپنی ذات ہی کو اس میں بند کرکے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہوں اور پھر شام کو جاتے ہوئے دوبارہ اسے نکال لیتا ہوں۔

باہر تھیٹر والوں کی گاڑی کھڑی رہتی ہے۔ اس کا ڈرائیور مجھے آنکھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہتا ہے اور میں شہر کے جدید ترین تھیٹر میں پہنچا دیا جاتا ہوں۔ جس کا پنڈال بالکل سرکس کے پنڈال جیسا ہے۔ میں اس تھیٹر میں پچھلے اٹھارہ برس سے ایک ہی رول ادا کر رہا ہوں۔ سٹیج بالکل وسط میں ہے اور میرا پہلا میک اپ اتار کر "گلی ور" کا میک اپ اور لباس پہنا دیا جاتا ہے مکالمے سب بیک گراؤنڈ سے ہوتے ہیں۔ مجھے صرف لی پت والوں کی مار کھانے کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان کے ننھے ننھے سوئیوں جیسے بھالے میرے جسم میں چبھتے ہیں۔ ان کے کمانوں سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے تیر میرے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ میرے مساموں سے خون کی بوندیں پسینے کی طرح نکلتی ہیں۔ مجھ میں خوبی یہی ہے کہ میں تکلیف کا اظہار نہیں کرتا اس لئے اتنے برسوں سے یہ سب چل رہا ہے۔ یہاں سے مجھے ملتا کچھ نہیں یہ تو محض ہابی کے طور پر ہے۔ پھر جب شو ختم ہو جاتا ہے تو مجھے ایک اسٹریچر پر لٹا کر ایک باتھ روم میں لے جاتے ہیں۔ جہاں الکوحل سے بھرے ہوئے ٹب میں مجھے ڈال دیا جاتا ہے۔ الکوحل میرے زخموں میں ٹیسیں پیدا کرتی ہے پھر ایک دم خنکی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور میں تازہ دم ہو کر گھر کی طرف بڑھتا ہوں۔

ایک دن عجیب تماشا ہوا۔ جب اس عمارت کے دروازے بند ہونے کا وقت آیا' تب میں پیشاب خانے میں تھا۔ میرے پیچھے دھپ سے دروازہ بند ہوا۔ میں گھبرا کر زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ تب ایک آدمی نے آکر دروازہ کھولا۔ میں اس تصور سے ہی اس قدر گھبرا گیا تھا کہ اگر

مجھے ساری رات اس پیشاب خانہ میں بند رہنا پڑتا ہے تو میری کیا حالت ہوتی۔ گھبراہٹ میں چلتے وقت میں نے اس کیبن کی طرف بھی دھیان نہ دیا کہ آیا وہ عورت چلی گئی ہے یا نہیں اور نہ اس لاکر میں رکھی ہوئی اپنی ذات ہی نکالنے کا خیال آیا۔ باہر تھیٹر کی گاڑی کا ڈرائیور ہارن پر ہارن بجائے جا رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چل دی۔

میں بہت پریشان تھا کہ آج اپنی ذات کے بغیر میں اپنا رول کیسے ادا کر پاؤں گا۔ مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس دن شو ختم ہونے پر بھیڑ اپنی کرسیوں سے اٹھ کر میری طرف لپکی اور میری اداکاری کو اتنا قدرتی بتایا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

تب سے میں نے اپنی ذات کو اس لاکر ہی میں پڑا رہنے دیا ہے۔

ہوا کے ایک جھونکے نے کھڑکی کے پٹ کو زور سے پٹخ دیا ہے۔ میں پھر اپنے کمرے کے ماحول کی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں..... سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی سرسوتی کی سسکیوں کی آواز روتے ہوئے بچے کی کرب ناک آواز میں اب تک ایک اور آدمی کی آواز بھی شامل ہو گئی ہے۔ شاید بچے کا باپ بھی جاگ گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی لاش اور بلکتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ضبط نہیں کر سکا۔

ایک اچھے پڑوسی کے ناطے میرا فرض ہے کہ ان کے سکھ دکھ میں حصہ بٹاؤں۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی درخت کے سائے تلے کھلے ہوئے آزاد پھول ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے' میں اپنے کمرے کی چاروں دیواروں میں سے ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر ارد گرد کمرے میں جھانک کر انہیں سوتے ہوئے یا روتے ہوئے دیکھوں۔ کیونکہ دونوں ہی حالتوں میں آدمی بے بسی کی حالت میں ہوتا ہے۔ مگر میں بھی کتنا کمینہ آدمی ہوں۔ لوگوں کو بے بسی کی حالت میں دیکھنے کے شوق میں سارے کمروں کی دیواریں اکھاڑ دینا چاہتا ہوں۔

میں نے پھر اٹھ کر خود کو ان کے کمروں میں جا کر ان کے رونے کی وجہ دریافت کرنے پر آمادہ کیا۔ رونے کی آوازیں اب کافی بلند ہو چکی تھیں اور ان کی وجہ سے کمرے میں بند رہنا ممکن نہ تھا۔

میں نے وہی کفن جیسی سفید چادر اپنے گرد لپیٹی اور سیاہ سلیپر پہن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جوں ہی میں نے دروازے کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی' میں نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے والی سرسوتی' بلک بلک کر رونے والا بچہ' مری ہوئی عورت اور

اس کا مجبور خاوند' چاروں باہر کھڑے تھے۔

چاروں نے بہ یک زبان مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے' آپ اتنی دیر سے رو رہے ہیں؟ ایک اچھے پڑوسی ہونے کے ناطے ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ.....!"

موم کی مریم

جیلانی بانو

آج بھی کمرے میں لیٹا میں خیالی ہیولوں سے کھیل رہا تھا۔

اور جب بھی اندھیرا چھا جاتا ہے تم نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو جیسے تم نے تاریکی کی کوکھ سے جنم لیا ہو۔ مجبوراً مجھے جلے ہوئے سگریٹ کی راکھ کی طرح تمہیں بھی ذہن سے جھٹک دینا پڑتا ہے۔

میں نے کبھی تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے، کبھی تمہاری آواز پر نظمیں نہیں لکھیں، کبھی تمہاری یاد میں تارے گننے کا پروگرام نہیں بنایا، پھر میں تمہیں کیوں یاد کیے جاؤں! زندگی میں تم سے اتنی دور رہا کہ کبھی اس رنگ و بو کے سیلاب میں غرق نہ ہو سکا جو تمہارے چاروں طرف پھیلا رہا۔ ہمارے بیچ جھوٹی عقیدت اور مضحکہ خیز احترام کی خلیج حائل رہی..... پھر آج تم اپنی آہوں اور سسکیوں سے کون سے جذبے جگانا چاہتی ہو!

مجھے آج صبح ہی عائشہ کے خط سے تمہاری موت کی خبر مل چکی ہے۔ لیکن میں اس موت پر اظہار افسوس نہ کر سکا اور نہ جانے کتنے بادل بنا برسے گزر جاتے ہیں۔ کتنے نغمے ساز کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنے انسان ایک لمحے کی خوشی ڈھونڈتے مر جاتے ہیں۔ پھر تمہاری موت تو میرے سامنے کئی بار ہو چکی ہے حالانکہ مادی طور پر تم چلتی پھرتی نظر آتی تھیں، بالکل یونہی جیسے آج میرے کمرے میں آ بیٹھی ہو۔

مگر اس وقت میں تمہارے خیالی وجود سے باتیں نہیں کر رہا ہوں کیوں کہ جب تمہاری جانی پہچانی سسکیاں تمہارے وجود کا یقین دلا رہی ہوں تو میں اسے واہمہ کیسے سمجھ لوں! تمہارا اور

اندھیرے کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے تم جہاں جہاں بھی گئیں چراغ گل ہوتے گئے۔ تاریکی کے حلقے تمہیں اپنے گھیرے میں لیتے گئے۔ جس طرح مریم کی تصویر کے گرد مصور نور کا ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ تقدس اور معصومیت کی لکیریں! جن کے اندر مریم کی روح کو محصور کر دیا گیا ہے (عورت کی روح کو کیسے کیسے شکنجوں میں کسا گیا) اس وقت بھی جب تمہارے مستقبل کی طرح میرے کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا ہے تمہارے آنسو یوں چمک رہے ہیں جیسے کسی برہمن نے دریا کی سطح پر چراغوں کی قطار چن دی ہو۔ میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اجالے کی امید قائم رکھی ہے۔

(ہم مشرق کے مرد صدیوں سے اپنی عیش گاہوں میں تمہارے اشکوں سے جشن مناتے آئے ہیں) تمہارے متعلق لوگوں نے جو کہانیاں مشہور کر رکھی تھیں وہ بالکل سطحی تھیں۔ اس لیے میں نے حقیقت کی روشنی میں آ کر تمہیں سمجھنا چاہا۔ تم کیا تھیں...؟ اماوس کی رات کو ٹوٹنے والا ایک ستارہ جو اپنی آخری جھلک سے بہت دلوں میں امید کی ایک کرن جگا کر غائب ہو جائے۔ ایک تند لہر جو اپنے زعم میں ساحل کے پرخچے اڑانے کے ساتھ خود بھی مٹ گئی ہو۔

آج جب تم اپنے گناہوں کی لمبی فہرست سمیت خود ہی میرے کمرے میں آ گئی ہو' مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تم ایک عام لڑکی ہونے کے باوجود دوسروں سے کس قدر مختلف تھیں۔ تم ایک مسحور کرنے والا جادو بن گئیں جو کتنے ہی خریداروں کو کھینچ لایا' مگر سونگھا ہوا پھول سمجھ کر سب واپس چلے گئے۔

دوکان دار کے نزدیک وہ چیز کتنی حقیر ہو جاتی ہے جسے گاہک الٹ پلٹ کر پھر دوکان میں رکھ دے۔

شیشے کے کیس میں بند رہنے والی گڑیا..... آج تم اتنی صاف صاف باتیں سن کر حیران کیوں ہو رہی ہو جبکہ تم نے آس پاس کے شیش محل چکنا چور کر ڈالے تھے۔ اور سماج کی کھینچی ہوئی لکیروں پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار تم سب لڑکیوں کو آنگن میں دھما چوکڑی مچاتے دیکھ کر امی نے کہا تھا۔

"اونہہ مت روکو نگوڑی ماریوں کو..... کنواری لڑکیاں برساتی چڑیاں ہوتی ہیں کون جانے کل کس کا ڈولا دروازے پر کھڑا ہو گا۔"

اس وقت اخبار پڑھتے پڑھتے میں نے تمہاری زندگی کی پوری فلم دیکھ ڈالی۔

جب تم کسی ناصر' شاہد' کلرک سے بیاہ رچا کر آنسو پونچھتی ڈولے میں سوار ہو کر چلی جاؤ

گی۔ ہر سال ایک منے کی پیدائش میں اضافہ ہوتا رہے گا اور آٹھویں یا دسویں منے کی پیدائش پر تپ دق کا شکار ہو کر مر جاؤ گی.... ہر لڑکی اپنی لکیروں پر دوڑتی آئی ہے۔ مگر تم نے اپنی انفرادیت سے ایک نیا راستہ ڈھونڈنا چاہا' جس کی سزا میں تم پر موت و زندگی حرام ہو گئی۔

تم منجھلے چچا کی دسویں یا گیارہویں اولاد تھیں اور نامراد لڑکی....

"اونہہ لڑکی ہے تو کیا' نصیب اچھے ہوں' لڑکے کون سا فیض پہنچاتے ہیں۔ ماں باپ کی موت پر آنسو بہانے والی تو بیٹی ہی ہوتی ہے۔"

اور اپنی موت کے نوحہ گر کے پیدا ہوتے ہی کسی نے تمہیں خوش آمدید نہ کہا۔ اپنے آس پاس کے اس ماحول نے تمہیں زیادہ حساس بنا دیا۔ حقارت بھری نظروں نے تمہاری خود داری کو بھڑوں کے چھتے کی طرح چھیڑ دیا۔ اور تم نے کچھ کرنے' کچھ پانے کی قسم کھا لی۔ تمہارے متعلق بدنامیاں اور سرگوشیاں بڑھتی گئیں۔ جاہل' بد دماغ' بدصورت اور مغرور جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا۔ لیکن تم ایک ننھی سی چڑیا کی طرح اترا اترا کر کہتیں "جو میرے پاس ہے وہ راجہ کے محل میں نہیں" اسی انانیت پسندی سے تم ایک ایسا شعر بن گئیں جس کے' غالب کے شارحین کی طرح' ہر ایک نے الگ معنی نکالنے چاہے' مگر پھر بھی بہت کم حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکے اور میں نے بہت دور ہو کر بھی سمجھنا چاہا.... یہ سچ ہے میں نے دوسرے مردوں کی طرح تمہاری دوشیزگی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا..... کبھی اتنے نزدیک نہیں آیا کہ تمہارے تنفس کی رفتار سے کوئی راز پا سکوں..... پھر بھی اس شعر پر میں نے کافی ریسرچ کی' دماغ کی لیبارٹری میں دو سال تک تجربے کیے مگر کچھ نہ سمجھ سکا۔ ایک بار مجھے اپنی جانب جھکتے دیکھ کر تم نے کہا تھا۔

"احمد بھائی میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اور یہ نہیں چاہتی کہ کوئلوں کی دلالی میں آپ بھی اپنے ہاتھ کالے کر بیٹھیں۔"

مگر یہ کتنا بڑا حزنیہ ہے کہ تم نے بہت سوں کو کوئلے کی دلالی سے بچانے کی خاطر اپنے منہ پر کالک مل لی تھی' تاکہ ان کے سفید دامن سیاہی سے ملوث نہ ہوں.... تم میری بہت عزت کرتی تھیں۔ ایک نوجوان مرد کی' جو تمہارے ذرا سے سہارے پر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ جس نے اٹھارہ سال کی عمر میں تم کو کئی بار فریب دیے۔ منزل کے قریب لاکر بھٹکا دیا۔ بدنامی کی کوٹھڑی میں دھکیل کر ہر دروازہ بند کر دیا۔ پھر تم نے اپنی رہی سہی عزت کی دھجیاں بکھیر ڈالیں۔ اور بیچ چوراہے پر اپنے سب ظاہری لباس نوچ پھینکے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ تم میری عزت کرتی رہیں۔ اور میں تمہیں سمجھنے میں اتنا منہمک ہو گیا کہ جذبات کے انجکشن قطعی بے اثر ہو گئے ورنہ ممکن تھا

ایک دن میری خودداری تمہارے قدموں پر پڑی بخشش کی طلب گار ہوتی اور تم اطہر کی طرح مجھے ایک چٹان پر چھوڑ کر کہتیں۔

"میں نے تمہیں پانے کے لیے بہت سی ٹھوکریں کھائیں مگر تمہارے چھونے سے پہلے اتنی بلندی پر پہنچ گئی کہ جب تم وہاں پہنچے تو میں سراب بن چکی تھی۔"

گھبراؤ مت تم نے یہ الفاظ اطہر یا ریاض سے خود نہیں کہے۔ لیکن آج تک تم نے اور کون سی باتیں زبان سے ادا کی ہیں.... تم تو اس گونگی کی طرح ہو جسے اپنا مفہوم ہمیشہ عملی طور پر سمجھانا پڑتا ہے..... بظاہر تم کتنی معمولی سی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کاندھوں تک لہراتے ہوئے بال' جن کی باریک باریک آوارہ لٹیں چہرے کے گرد ہالہ بنائے کانپتی رہتیں۔ معمولی سا قد' دبلا پتلا دھان پان سا جسم' جیسے تیز ہوا کے جھونکے بھی تمہیں اڑا کر لے جائیں گے۔ جیسے تمہاری جانب ہاتھ بڑھایا تو چھوٹی موئی کی طرح کمہلا جاؤں گی۔ ایک واہمہ سی۔ ادھورا خاکہ۔ کتنے ہلکے ہلکے تھے تمہارے خدوخال۔ پتلے خمیدہ لب جو ہمیشہ سرد مہری سے بند رہتے۔ ہر چیز کو تجسس سے دیکھنے والی ہمدرد آنکھیں' جو اپنے سارے گناہوں کو آشکارا کرنے کو تیار رہتیں اور اسی خیال سے بات کرتے وقت بار بار بند ہو جاتیں تاکہ ان کی گہرائیوں کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔ اور ہر لحہ بدلنے والا رنگ' جو کبھی شعلہ کی طرح دہکنے لگتا۔ کبھی مٹی کی طرح میلا پڑ جاتا۔ جب تم بات کرتیں تو تمہارے نقوش بالکل نہ بدلتے کتنی مشکل بات تھی تمہارے چہرے سے کسی بات کا اندازہ لگانا!

اس معمولی سی شکل و صورت ہی نے تو گھر میں تمہیں ایک ناقابل التفات چیز بنا دیا۔ اپنی خوبصورت سعادت مند بہنوں کے مقابلے میں تمہاری کوئی قیمت نہ تھی۔

خرید و فروخت کے اس بازار میں صرف اچھی صورت والی لڑکی کے اونچے دام لگتے ہیں۔ چچا اور چچی کے لیے یہ خیال سوہانِ روح تھا۔

مجھے آج سے تین سال پہلے والی جاڑوں کی ایک صبح یاد آ رہی ہے۔ تم اس وقت نہا کر آئیں تھیں۔ نسرین اور عائشہ کے ساتھ صحن میں بیٹھی سوئٹر کا نمونہ بنا بنا کر ادھیڑ رہی تھیں۔ نومبر کی لطیف دھوپ آنگن میں بکھری ہوئی تھی۔ چچی نیچے بیٹھی نئے لحافوں کو تگند رہی تھیں۔ اس وقت تمہارے گلابی دوپٹے' بھیگے بال اور نکھرے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی شعر یاد نہیں آیا۔ کوئی تشبیہ دماغ میں نہیں ابھری۔ عائشہ' نسرین' اور فرزانہ کے فروزاں حسن نے تمہارے چراغ کو ٹمٹمانے بھی نہیں دیا۔ کتنی کمتر تھیں تم' مغرور اور اپنے حسن کے ہتھیاروں سے واقف بہنوں کے حلقے میں..... اس وقت میں نے سوچا تھا کہ حسن کے اس جمگھٹ میں

تمہاری کہانی کتنی پھیکی اور مختصر ہو گی۔

انہی دنوں مسلسل بے کاری نے مجھے نئی نئی راہوں سے واقف کرایا۔ گھر سے بہت دور ایک ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہوا تو عائشہ کے خط سے پہلی بار تمہاری جانب متوجہ ہوا تھا۔ تم لڑکیوں کو خط لکھنے کے لیے بھی تو کوئی بات نہیں ملتی۔

عائشہ کے خط بھی اس کی طرح خاموش اور معصوم ہوتے ہیں۔ جن میں ابا کی ناراضگی سے لے کر خاندان کی اہم تقریبوں میں آنے والی عورتوں کے کپڑے' زیوروں کے ڈیزائن اور اسکول کی سہیلیوں کے رومان تک' ہر چیز کا ذکر تفصیل سے ہوتا۔ ساتھ ہی مجھے بھی ایسا ہی مزے دار لمبا خط لکھنے کی ہدایت کرتی۔ میری بہن جو نہیں جانتی تھی کہ میں رومانوں' سرگوشیوں اور رنگینیوں سے کتنا دور تھا۔ لیکن وہ میری مسلسل خاموشی کے باوجود' ایک ہنگامہ پر گھر کے کمرے میں بیٹھی' بار بار منہ پر جھک آنے والی لٹوں کو پیچھے جھٹک کر لکھتی رہی' "آپ نے اور سنا بھائی جان! قدسیہ کے یہاں چھوٹی خالہ امجد بھائی کا پیغام لے کر گئیں تو قدسیہ نے خود آ کر کہہ دیا کہ وہ امجد سے بیاہ نہیں کرے گی۔ سنا ہے چچا ابا زہر کھانے والے ہیں۔ سارے خاندان میں تھوتھو ہو رہی ہے۔"

اس دن بہت دن کے بعد میں جیل کی منحوس کوٹھری میں مسکرایا تھا۔ اس دلیرانہ جرأت پر غائبانہ تمہاری پیٹھ ٹھونکی تھی اور محسوس کیا تھا کہ جس خول میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہیں وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا ہے۔ جی چاہا چچا ابا کو ایک زہر کی شیشی فوراً پارسل کر دوں تاکہ وہ صرف ارادہ کر کے ہی نہ رہ جائیں۔ تم پھر ایک بار میرے سامنے آئی تھیں۔ جھنجلا کر سوئٹر ادھیڑتی ہوئی۔ پھر میں اس واقعہ کو بھول گیا۔ عائشہ اپنے خطوں میں لکھتی رہی کہ تمہارا اور ریاض کا رومان چل رہا ہے۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش مت کرو..... مجھے معلوم ہے کہ تم نے اس محبت کو کامیاب بنانے کی کتنی کوشش کی..... لیکن ریاض تمہارے یہاں کا لے پالک تھا۔ تمہارے دسترخوان کے ٹکڑوں پر پلا تھا۔ پھر چچا ابا کو اس محبت کی سن گن ملی تو ریاض کو گھر ہی سے نہیں بلکہ شہر سے نکال دیا گیا اور تم نے بڑے تحمل سے محبت کی اس لاش کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہا..... لیکن شاید ایسا نہ ہو سکا کیوں کہ مردار کھانے والے گدھ' جو ایسے موقعوں کی تلاش میں پھرتے ہیں اس لاش کو باہر کھینچ لائے۔ جی بھر کے لطف اٹھایا اور چیر پھاڑ کے پھینک دیا۔ تمہاری بیماری کو بڑے معنی پہنائے گئے۔ یعنی یہ سب ریاض کی امانت کو ٹھکانے لگانے کے بہانے ہیں اور تم اپنے بند کمرے میں نہیں پڑی رہتیں۔ بلکہ ریاض کے ساتھ

فرار ہو چکی ہو۔

یہ افواہیں میں نے بہت دور بیٹھ کر سنیں اور ہر بات کو یقین کے خانے میں ڈالتا گیا۔ یہ کوئی ناقابل یقین بات بھی تو نہ تھی۔ بقول عائشہ کے تم اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور تم نے ساری دنیا کو ٹھکرا کر اپنی من مانی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا..... پھر تم جیسی محبت کی ماری لڑکیاں اس سے زیادہ اپنی اہمیت کا ثبوت کیا دے سکتی ہیں۔

اس کے بعد جب میں رہا ہو کر گھر آیا تو تم وقت کا اہم موضوع بن چکی تھیں۔ یا عائشہ کے الفاظ میں کچھ کرنے کی دھن میں اپنا رہا سہا وقار بھی کھو چکی تھیں۔

اس دوران میں تم اپنے ماسٹر سے محبت کر چکی تھیں' جو تمہیں پڑھانے آتا تھا ایک سیدھا سادا خطرناک حد تک شریف انسان' جو اپنی مظلومی اور بے چارگی ظاہر کر کے دوسروں سے رحم کی بھیک مانگتا تھا۔

پہلے اس نے تمہیں عزت اور شرافت کے سبق پڑھائے' اپنی بے چارگی اور دکھ کے افسانے سنائے۔ اس کی محبوبہ نے اسے دھوکہ دیا تھا۔ محض غریبی کی وجہ سے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ (یہ محبوباؤں کے دھوکہ دینے کا دکھڑا بھی کتنا فرسودہ ہو چکا ہے۔)

پھر اس کی پیاسی دنیا میں تم نے اپنی ہمدردی کے چند قطرے برسانا چاہے۔ اپنے طرز عمل سے اس کا دکھ کم کرنا چاہا۔ اپنے غم کی کہانی بھی اسے سنا ڈالی۔ کورس کی کتابوں کو ایک جانب سمیٹ کر تسکین و تسلی کے سبق پڑھائے جانے لگے۔

تمہارا ماسٹر بیمار ہو گیا اور چچا ابا نے دوسرا ماسٹر رکھنا چاہا تو تم نے انکار کر دیا۔ تم اس ماسٹر سے پڑھنا چاہتی تھیں۔ اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے گھر جانے پر مصر تھیں۔ یہ ساری باتیں گھر کے چھوٹے بچوں تک نے مجھے سنائیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہیں اس ماسٹر سے محبت نہیں صرف ہمدردی تھی۔ یہ انسانیت کا جذبہ ہی ایک رات چپکے سے اٹھا کر تمہیں ماسٹر کے گھر لے گیا اور جب تم دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں تو چچا ابا کے ڈنڈے کی ضرب سے بے ہوش ہو گئیں۔

پھر مہینوں گھر والے تمہارے سائے سے اچھوتوں کی طرح بچتے رہے۔ گھر کی لمبی لمبی ناکوں والی عورتوں نے برادری میں نکلنا چھوڑ دیا۔ چچا ابا نے وقت سے پہلے پنشن لے لی اور تم سارے خاندان پر کلنک کا جھومر بن کر لہرانے لگیں۔

لڑکیوں کو تمہارے قریب بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر تم شانِ بے نیازی سے رہتی تھیں

"گنگا ری گنگا تو کہاں لہرائے؟ میں پاؤں بھی تو ڈبوؤں!"

اور بیچ آنگن میں کھڑے ہو کر تم نے اماں سے کہا "میرا جو جی چاہے گا کروں گی یا پھر آپ لوگ مجھے مار ڈالیے۔"

پھر سب نے دوسری بات سے اتفاق کر لیا۔ سب نے تم پر فاتحہ پڑھ ڈالی۔ مگر شمیم ماموں اس فاتحہ میں شریک نہیں ہوئے۔ رفتہ رفتہ دوسرا غم بھی بھولنے لگا' کچھ شمیم ماموں کی ناز برداریوں نے اسے مٹا ڈالا۔ وہ تم پر بے حد مہربان تھے۔ عائشہ کہتی تھی "شمیم ماموں کی عذرا بھی تو قدسیہ کی کلاس فیلو ہے جیسی ان کی بیٹی ویسی قدسیہ پھر وہ کیسے ایک لڑکی کو گھل گھل کر مرتا دیکھیں۔" شمیم ماموں بڑی مدت سے بیوی بچوں سے قطع تعلق کیے بڑی رنگین زندگی گزار رہے تھے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ ان کی بیوی کبھی اچھی ساری نہ باندھ سکیں۔ (ایک بار عائشہ نے لکھا تھا کہ بہترین ساری باندھنے پر تم انعام لے چکی ہو) وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کے تمہیں سیر کرانے جاتے ہیں۔ تمہارے صدقے میں سارا گھر سینما دیکھتا' پکنک پر جاتا' موٹروں میں گھومتا' تم کوئی اعلیٰ ڈگری لینا چاہتی تھیں اور چچا ابا تمہیں تنہا ہوسٹل میں چھوڑنے پر تیار نہیں تھے اس لیے بے چارے شمیم ماموں اپنی وکالت کے بے شمار اہم کام چھوڑ کر بارہ بارہ بجے رات تک فارسی اور اردو شاعروں کا کلام پڑھاتے۔ عشق و تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار کا مطلب تم سے پوچھتے اور ان میں چھپے ہوئے نکتوں کی وضاحت پر جھوم جھوم اٹھتے۔

سب طرف سے ٹھکرائے جانے سے پہلے تم خود ہی کسی سے بات نہ کرتی تھیں۔ دن بھر پلنگ پر اوندھی پڑی نہ جانے کیا کیا سوچا کرتیں۔ کوئی بات نہ کرتا تو شکایت نہ کرتیں۔ شمیم ماموں سر پر ہاتھ پھیرتے تو منع نہ کرتیں۔ ہاتھ پکڑ کر موٹر میں بٹھا دیتے تو بیٹھ جاتیں۔ ممکن ہے تم سے ان کی ویران زندگی نہ دیکھی گئی ہو اور انسانیت کے تقاضے نے مجبور کیا ہو!

پھر تمہاری یہ روش کتنی تعجب خیز تھی۔ ممانی کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا اور سب کی سوالیہ نظریں تمہارے چہرے پر گڑ گئیں۔

ایک رات جب تم شمیم ماموں سے پڑھ رہی تھیں' کمرے میں کچھ شور سا ہوا اور تم بغیر دوپٹے کے کمرے میں بھاگتی ہوئی آئیں اور پلنگ پر گر کر رونے لگیں۔

پیچھے پیچھے گھر کے سب لوگوں کی لمبی قطار تھی۔ میں بڑی دلچسپی سے تماشہ دیکھنے لگا۔ چچی نے اپنی دانست میں تمہاری پیٹھ پر بڑے زور دار دھموکے رسید کیے اور بہت سی مرغابیاں کڑ کڑانے لگیں۔ جواب میں سسکیاں روک کے تم نے بڑی مشکل سے کہا۔ "میں جدھر بھی جاؤں

سب مجھی کو برا کہتے ہیں مجھے کیا معلوم کہ وہ اتنا کمینہ....." مجھے ہنسی آ گئی۔ کوئی مرد ماموں نہیں ہوتا صرف کمینہ ہوتا ہے' جو عورت سے سب کچھ لینے کے بعد بھی اسے جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے علاوہ کچھ بھی نہیں دے سکتا۔

شمیم ماموں نے سوچا ہو گا کہ اگر ریاض یا ماسٹر تمہیں کوئی امانت نہ دے سکا تو وہ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں' جبکہ وہ کسی رشتہ سے تمہارے ماموں بھی بنے ہوئے تھے۔ پھر تو ان کی بیوی نے یہ خبر شہر بھر عام کر دی کہ تم چاہو تو بیوی بچوں والے مردوں کو بھی بہکا دو۔ شمیم ماموں جیسا پرہیز گار انسان تمہیں دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

کسی میوزیم میں رکھی ہوئی لاکھوں سال پرانی ممی کی طرح ایک نمائش کی چیز بن گئیں۔ چھتوں کو پھلانگتی ہوئی یہ بات سارے شہر کا گشت لگا کر تمہارے ماتھے پر چپک گئی۔ عورتیں اور لڑکیاں دور دور سے بچے کولھوں پر ہاتھ ٹکائے ناک پر انگلی رکھے تمہیں دیکھنے کو آتیں۔ مردوں کی محفلوں میں بلند قہقہوں اور فحش گالیوں کے دوران تمہارا نام آ جاتا تو خود بھی اس لٹنے والے باغ میں جانے کو طبیعت مچل اٹھتی۔ اطہر اسی مال غنیمت کی امید میں آیا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی' جو اپنی آوارگی کے سبب حوالات تک ہو آیا تھا۔ متوسط طبقے کا ایک بے کار نوجوان' جسے بے کاری نے مٹا ڈالا تھا اور سب اس سے مایوس ہو گئے تھے۔ متفقہ طور پر یہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی اسے بیٹی نہ دے گا۔ باہر کی تفریحوں کے علاوہ وہ کئی بار گھریلو لڑکیوں کو جھانسا دے چکا تھا بلکہ راحت کے متعلق تو یہ مشہور تھا کہ محض اطہر کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کا گھر چھوڑے بیٹھی ہے۔ مگر اتنے سیاہ کارناموں کے باوجود وہ تمہاری جانب سے مایوس نہیں لوٹا۔ ساری دنیا سے دھتکارا ہوا' منہ پھٹ' بے رحم' چیخ چیخ کر باتیں کرنے والا اطہر..... جسے ابا روز گھر سے نکال دیتے' امی کوسنے دیتیں اور عائشہ اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ جاتی۔ اگر بہنوں کے بھائی قابل فخر نہ ہوں تو وہ کتنی بدنصیب نظر آتی ہیں۔ خوب صورت کماؤ بھائیوں کے بھروسے پر ہی تو وہ نہ جانے کتنی ناکوں کو اپنے سامنے رگڑوا سکتی ہیں۔ عائشہ کی ساری توجہ میری جانب مرکوز ہو گئی تھی۔ میری خشک اور بے ربط زندگی میں لڑکیوں کے لیے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی اپنی اصول پسندی اور صاف گوئی کی وجہ سے میری شخصیت کو کافی اہمیت حاصل تھی۔

تمہاری بارگہہ میں اطہر کو کیسے شرف نیاز بخشا گیا! یہ بات سب کے لیے حیران کن تھی۔ وہ تو اپنے خوب صورت جسم اور بے باک لہجے سے معرکے سر کر آتا تھا لیکن تم نے ہمیشہ بجھے دل اور بیمار ذہن تلاش کیے تھے۔

یہاں پر مجھے اپنی پچھلی ریسرچ بے کار معلوم ہوئی اور اسے اٹھا کر پھینکنے سے پہلے میں نے تم سے راہ و سم بڑھانا چاہی۔ مجھے گھر میں بہت کم رہنے کا اتفاق ہوتا تھا خصوصاً تم سے کبھی بے تکلف بات کرنے کی فرصت نہ ملی۔ اس ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے بہت دور رہے۔ تم مجھ سے ہمیشہ چھپنا چاہتی تھیں' کیوں کہ پہلے دن ہماری ملاقات نے بڑی تلخ فضا پیدا کر دی تھی۔

اس دن ہم ناشتے کی میز پر ملے تھے۔ تم شاید میرے متعلق عائشہ سے پہلے ہی سن چکی تھیں اور مجھ تک اپنے کارنامے پہنچانے سے گریز کر رہی تھیں۔ احتیاط سے سر پر پلو ڈالے' نظریں جھکائے یوں بیٹھی تھیں۔ جیسے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے آئی ہو۔ عائشہ نے میری طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا تھا "بھائی جان دیکھیے' یہ ہیں قدسیہ۔" عائشہ کی طنزیہ نظروں کو تم نے پکڑ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر خشک لہجے میں کہا "تو احمد بھائی مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟" اور تم چائے کی پیالی رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

برسات کی ایک شام کو ہلکی ہلکی رم جھم نے موسم بڑا پرکیف بنا دیا تھا۔ حسب عادت دھوئیں سے خیالی ہیولے بنا رہا تھا۔ عائشہ' پروین' چھوٹی بھابی' اور فرزانہ قریب بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں اور کسی فلم پر زور دار بحث ہو رہی تھی۔ ایک ہیرو دو لڑکیوں سے بیک وقت محبت کرتا ہے اور ڈائریکٹر ہر بار اس کی محبت کو سچی بنانے پر مصر ہے۔ عائشہ کے خیال میں یہ محبت کی توہین تھی یا ہیرو کی بو الہوسی۔ تم ان کے قریب بیٹھی' سیاہ ساٹن کے ایک ٹکڑے پر ننھے آئینے ٹانک رہی تھیں جن کی بہت سی شعاعوں نے تمہارے چہرے پر مشعلیں جلا دی تھیں۔ اپنی رائے کو وزنی بنانے کے لیے عائشہ نے مجھ سے پوچھا "آپ بتائیے بھائی جان' کیا محبت ایک سے زیادہ بار کی جا سکتی ہے؟"

اور میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا "قدسیہ سے پوچھو۔" تمہارے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے۔ چہرے پر جلتی ہوئی مشعلیں بجھ گئیں اور شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

بھابی اور فرزانہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگیں۔ پروین بات ٹالنے کو گنگنانے لگی اور عائشہ نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے اس خوبصورت شام کا زر لباس نوچ کر پھینک دیا۔ رم جھم شور مچانے والی بوندیں آنسوؤں کے دھارے بن گئیں اور کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا۔

"آج موسم کتنا خوش گوار ہو رہا ہے۔"

"ہونہہ۔"

"جی چاہ رہا ہے کہیں باہر گھومنے جائیں۔"

"تو جایئے۔" تم حسب عادت مختصر جواب دے رہی تھیں۔

"مگر کوئی ساتھ چلنے والا جو نہیں۔ اطہر نے وعدہ کیا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ بہت غیر ذمہ دار اور جھوٹا ہو گیا ہے یہ لڑکا۔" اطہر کی برائی کر کے میں نے تمہارے چہرے پر کچھ ڈھونڈھنا چاہا' تمہاری آنکھیں کھلی ہوئی کتاب پر تھیں اور ہاتھ ٹیبل کلاتھ کی شکنیں درست کرنے میں مصروف' پھر بڑے طنز کے ساتھ تم نے کہا۔

"اتنے سہانے موسم میں تو وہ کسی بار میں بے ہوش پڑے ہوں گے! آپ لوگ تو انہیں اچھی جانتے ہیں نا۔" یہ تم کہہ رہی تھیں۔ تم..... جس کے متعلق مشہور تھا کہ تم نے سارے خاندان کی عزت جوتے کی نوک پر اچھال کر تم نے اطہر سے شادی کر لی ہے۔ سب سے چھپا کر اسے روپے دیتی ہو وہ شراب پی کر آتا ہے تو اس کی پردہ پوشی کرتی ہو۔ اتنے برے انسان پر تمہاری یہ عنایتیں کیوں تھیں جبکہ پچھلی زندگی میں کئی ناقابل اعتبار مرد دھوکہ دے چکے تھے....؟ تمہارے متعلق پھیلی ہوئی بدنامیوں کے درمیان مجھے اپنی رائے بڑی مضحکہ خیز لگی۔ اسے میں نے دماغ سے کھرچ دیا۔ تم سب کے لیے ناقابل فہم بن گئیں۔ بھول بھلیوں کی طرح تمہارے گرد مکروفریب کے جو جال بچھے ہوئے تھے مجھے ان سے نفرت ہو گئی۔ پھر ایک دن بڑا حواس باختہ سا میں تمہارے کمرے میں آیا۔

"میں تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں قدسیہ۔ اگر تم اجازت دو تو..... تو" اپنی گھبراہٹ پر میں خود متعجب تھا۔ اس دن تمہارے چہرے پر میں نے پہلی بار خوف کی پرچھائیاں دیکھیں' جن پر حیرانی غالب تھی۔ تم یوں کھڑی ہو گئیں جیسے شیم ماموں جھپٹنا چاہتے ہوں۔ تم نے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کر کہا:

"آپ بھی مجھے جاننا چاہتے ہیں احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں پھر آپ کیوں کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے کرنا چاہتے ہیں۔" اور تم پیچھے دیکھے بغیر باہر بھاگ گئیں تھیں۔

ان دنوں اتفاق سے مجھے تمہارا ایک خط ہاتھ لگا' جو تم نے شاید ریاض کو لکھا تھا مگر اسے نہ بھیج سکیں' یا شاید بھیجنے کو لکھا ہی نہ تھا' کیوں کہ یہ تو تمہاری روح کی پکار تھی۔ جسے ریاض جیسا بے وقوف انسان کبھی نہ سن پاتا۔ اس کی محبت میں تمہاری برتری اور پرستش کا جذبہ غالب

تھا اور تم اسے روح کی بلندی کبھی نہ دے سکتی تھیں۔ بھابھی کا ننھا راشد ناؤ بنوانے کو یہ خط تمہاری اٹیچی سے نکال لایا تھا۔ اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لیے میں نے اسے واپس رکھوانا چاہا مگر ایک بار پڑھنے سے باز نہ رہ سکا۔

میری جانب ملامت آمیز نظروں سے نہ دیکھو۔

ان دنوں میں تم پر ریسرچ کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کا ایک نکما انٹلیکچوئل۔

تمہارا یہ خط بہت سی ڈھکی چھپی حقیقتوں کو سامنے لے آیا اور میری رائے پھر ڈگمگانے لگی۔

اس خط میں لکھا تھا کہ تم نے بچپن سے ہر دل میں اپنے لیے نفرت اور حقارت پائی اور کسی نظر میں برتری حاصل کرنے کا یہ جذبہ ہی تمہیں ریاض کی جانب لے گیا جو تمہاری طرح سب کی جانب سے دھتکارا ہوا گھر کا دوسرا فرد تھا۔ ریاض کی نیاز مندی نے اسے گہرا کر دیا اور گھر والوں کی مخالفت نے اسے جنگل میں لگی آگ کی طرح بھڑکا دیا۔ پھر تم نے ہر قیمت ادا کر کے اسے پانے کا ارادہ کر لیا' مگر ریاض کے قدم اس دشوار راستے پر لڑکھڑا گئے۔ ابا کی ایک ڈانٹ پر محبت اچھل کر دور جا پڑی اور وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ گیا۔

خط کے آخر میں تم نے اسے خوب ذلیل کیا تھا..... بزدل تو سمجھتا ہے اس طرح تو نے اپنی محبت کو رسوائی سے بچا کر میری لاج رکھ لی۔ مگر ابھی ہماری محبت شروع ہی کہاں ہوئی تھی۔ میری عزت پہلے ہی کون سے جھنڈے پر چڑھی بیٹھی ہے..... میں تجھے وہ دے ہی نہ سکی جو میری زندگی کا آدرش تھا۔ کاش میں تجھے اس بلندی پر پہنچا سکتی جہاں میرا بھی ہاتھ نہ جاتا.... اب میری روح اس وسیع سمندر میں ایک تنکے کو تلاش کرتی پھرے گی۔

اب تم اس تنکے کی تلاش میں خوف ناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ تم' جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیل کی گرمی سے پگھل سکتی تھیں' کسی کی تیز نگاہوں سے سلگ سکتی تھیں' پھر اپنے چاروں طرف لپکنے والے شعلوں میں کیسے کھڑی تھیں۔

دوسرے دن تمہارے سامنے میں نے اطہر کو خوب ڈانٹا! "کل تم مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود کیوں نہیں آئے میں یہاں انتظار میں بیٹھا رہا اور جناب بقول قدسیہ کے کسی بار میں جمے رہے۔"

اطہر کے قہقہے رک گئے وہ یوں چپ ہو گیا جیسے میں نے اسے پھانسی کا حکم سنایا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ بڑا پشیمان سا میرے پاس آیا۔

اور اس نے میرے متعلق کیا کہا۔ اسے میری عادتوں کی خبر ہے۔ وہ بہت رنجیدہ ہے؟ زندگی میں پہلی بار میں نے اطہر کو شرمندہ دیکھا تھا وہ بھی کسی کی شکایت سننے کو تیار تھا۔ اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جبکہ تم ہمیشہ فریب دیتے آئے اور قدسیہ ہمیشہ فریب کھاتی آئی ہے۔"

"آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں بھائی جان!" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"قدسیہ کے بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ بڑی بدنصیب لڑکی ہے۔ میں سچ مچ بہت برا ہوں اور قدسیہ کو فریب دے کر بھی نقصان میں رہوں گا۔"

اطہر باہر چلا گیا اور تم ایک بار پھر میرے سامنے نئی گتھیاں لے کر آ گئیں۔ اطہر کون سا راستہ اختیار کر رہا تھا۔ وہ بے رحم انسان جو اپنے مفاد کے آگے کسی پر رحم نہ کر سکتا تھا۔

تم مجھے وہ کسوٹی نظر آئیں جس پر سونا اور پیتل دونوں واضح شکل میں چمک اٹھتے ہیں..... دو گناہوں کے اتصال سے اتنا پاک جذبہ بھی وجود میں آتا ہے؟ پھر تمہاری کہانی کا باقی حصہ نہ دیکھ سکا۔ میری مصروفیتیں مجھے آندھرا لے گئیں اور وہاں سے مجھے کلکتہ جانا پڑا۔ کلکتہ کی ہنگامہ پرور زندگی اور پُر جوش سرگرمیوں نے تمہاری محبت کی نیم مردہ رینگتی ہوئی کہانی بھلا دی اور گھر میں ہونے والے یہ چھوٹے چھوٹے حادثے ذہن کے کسی کونے میں تھک کر سو گئے۔

ایک بار عائشہ نے لکھا کہ اطہر کی مسلسل نافرمانیوں کے سبب ابا نے اسے عاق کر دیا ہے اور وہ گھر سے چلا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ تم اچانک گھر سے غائب ہو گئیں۔ کسی نے مجھے بتایا کہ تم دونوں لکھنؤ میں رہتے ہو۔ چچا ابا تمہیں واپس بلانے پر تیار نہیں ہیں۔ اس سے آگے کی کہانی مجھے کسی نے نہیں سنائی۔ مگر میں اس بات کا منتظر رہا کہ اب اطہر اپنا الو سیدھا کر کے بمبئی جائے گا۔ جہاں کئی برسوں کے بعد میں تمہیں ایک فلم میں دیکھوں گا! ہیروئن کے پیچھے! ایکسٹراؤں میں کولھے مٹکاتی ہوئی' کوئی آوارہ سا گیت تمہارے لبوں پر ہو گا جو تمہارے چہرے' پنڈلیوں اور چھاتیوں کی نمائش کرے گا۔ تم جھوٹ کا ایک خول ہو گی۔ سلولائیڈ کی گڑیا' ہر جنبش دوسروں کے تابع ہوتی ہے۔ تم اپنی خود داری کی لاش پر ناچ رہی ہو گی۔

ایک حد سے زیادہ جذباتی لڑکی کے تخیل کی اڑان یوں ہی کھائیوں میں گر کے دم توڑ دیتی ہے۔ مجھے تو دونوں کے نام سے نفرت ہو گئی۔ عائشہ نے ایک بار لکھا بھی کہ قدسیہ نے لکھنؤ کے کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی ہے۔ اطہر بیمار ہے اور وہ دونوں بڑی تکلیف سے دن

گزار رہے ہیں لیکن میں نے بڑی سختی سے لکھ دیا کہ اب میں قدسیہ کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اطہر کی یہ تبدیلی جتنی نفرت انگیز تھی اتنی ہی تعجب خیز بھی۔

کسی کی شادی کی خبر سن کر بھی وہ مذاق اڑایا کرتا تھا "ایک ہی راگ مسلسل کیسے سنے جاتے ہیں۔ میں تو دو ہی دن میں پاگل ہو جاؤں۔" پھر اس نے دو سال تک اس راگ کو کیسے سنا؟ امی اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہیں۔ ان کی زندگی کے دونوں پھل کڑوے نکلے۔ میں تو خیر اپنی آزاد زندگی سے انہیں کوئی فیض نہ پہنچا سکتا تھا مگر ابا یہ بھی برداشت نہ کر سکے کہ اطہر کی زندگی اچانک پلٹا کھائے وہ ایک دم شریف بن جائے اور کسی اچھی پوسٹ پر لے لیا جائے۔

پھر امی کے آنسوؤں نے ابا سے کئی خط لکھوائے جن میں اطہر کو خاندانی عزت اور بے شمار دولت کا واسطہ دیا گیا تھا اور تمہیں اطہر کی محبت کا۔ اور آج عائشہ نے لکھا ہے۔

"بھائی جان! آپ قدسیہ سے نفرت کرتے رہیے! کیوں کہ آئندہ کوئی اس کی بات نہ ہو گی جو میں آپ کو سناؤں آج تنہا اطہر بھائی کو ابا گھر لے آئے ہیں قدسیہ کسی معمولی سی بیماری سے مر چکی ہے۔"

تم زندگی بھر میری عزت کرتی رہیں اور میں تم سے نفرت کرتا رہا۔

یہ اپنی اپنی قسمت کا قصور ہے۔ ادھر منہ کرو۔ تمہارے چمکتے آنسو کیا کہہ رہے ہیں۔

کیا سچ مچ تم کسی معمولی سی بیماری سے مر گئیں! اس چھوٹی سی بیماری کو اپنے نازک جسم پر نہ سہہ سکیں اور اس بیماری کا علاج کسی سے نہ ہو سکا۔ اطہر سے بھی نہیں تمہیں اپنی شکست پر آنسو نہ بہانا چاہیے کیوں کہ اطہر کو تم نے وہ تحفہ دے دیا ہے۔ جن کے لیے تم زندگی بھر سرگرداں رہیں اور چپ چاپ اندھیرے میں کھو گئیں۔ اب تمہاری روندی ہوئی سسکیاں اور جھلملاتے ہوئے آنسو ہی مجھے تمہاری موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

تم آج پھر گھٹی گھٹی آہوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے اس کمرے میں میرے لیے اپنی عزت کا تحفہ لے کر آئی ہو لیکن میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا کہ جلے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینک کر تمہارے خیال کو ذہن سے جھٹک دوں۔

قبر

رام لعل

میں پورے سفر میں سو نہیں سکا تھا۔ سفر بہت طویل تھا اور تھکا دینے والا بھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ سفر کچھ راتوں اور دنوں کا نہیں کئی قرنوں کا ہے۔ میرے بدن کے جوڑ جوڑ سے جو درد اٹھ رہا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہے گا۔ میری آنکھوں میں جو کانٹے گھسے ہوئے ہیں وہ مجھے زندگی بھر چین سے نہیں سونے دیں گے اور میں ہمیشہ اسی طرح سرگرداں رہوں گا۔ شہر بہ شہر۔

اس دن میں جبل پور سے آ رہا تھا۔ میرے ساتھ میری بیوی بلقیس اور تین بچے حامد، نجمہ اور نسرین بھی تھے۔ ایک گاڑی ہم نے الٰہ آباد میں تبدیل کی تھی، یہ گاڑی ہمیں لکھنؤ لیے جا رہی تھی۔ لکھنؤ سے ہمیں ایک اور گاڑی میں بیٹھ کر اقبال پور جانا تھا۔

اقبال پور جانا میں نے کبھی پسند نہیں کیا تھا، جب سے میں نے شادی کی تھی وہاں صرف دو ہی بار پہلے جا چکا تھا۔ وہ بھی بلقیس کے اصرار پر کیوں کہ وہ وہاں کی رہنے والی تھی۔ وہ ہر سال وہاں چند روز گزار کر آتی تھی۔

میں آپ کو جبل پور کے بارے میں بھی کچھ بتا دوں۔ وہاں میں اٹھارہ سال سے مقیم تھا۔ ٹرانسپورٹ کے محکمے میں نہایت معقول تنخواہ پر ملازم تھا اور ایک بہت خوبصورت اور آرام دہ مکان کا مالک، جو میری برسوں سے بچا بچا کر رکھی ہوئی کمائی کا ثمرہ تھا۔ ایسا ثمرہ ہے جسے پا کر کسی بھی شخص کی بیوی اپنے شوہر پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، لیکن بلقیس کو اس مکان کا آرام اور خوبصورتی کبھی پسند نہیں آئی۔ اس نے میری کسی بھی خوبصورت چیز کو کبھی تو صیفی نگاہوں سے

نہیں دیکھا۔ مجھے دوستوں کو دعوتیں دینا مرغوب ہے جس کے لیے وہ ناک بھوں چڑھا لیتی ہے۔ میں برج کا شائق ہوں اس نے اس کھیل کی الف ب بھی جاننا پسند نہ کیا۔ لیکن پھر بھی میں نے اس سے بے انتہا محبت کی ہے۔ گذشتہ بارہ برس میں جب سے وہ میرے گھر کی زینت بن کر آئی ہے میری محبت میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ اس سے اس بات کے لیے کبھی خفا نہیں ہوا کہ اس نے میرے خوبصورت گھر کو کیوں پسند نہیں کیا' وہ میرے گھر میں خود کو اجنبی کیوں سمجھتی رہی ہے۔ میں اس سے اس لیے بھی خوش رہا ہوں کہ اس نے مجھے نہایت خوبصورت اور شرارتی بچے دیے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر میں اپنا ہر غم بھول جاتا ہوں ہر کمی بھول جاتا ہوں' میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکایت باقی نہیں رہ جاتی' بلقیس نے جب کبھی مسکرا کر میری طرف دیکھا ہے میرے اندر جینے کی لگن اور بڑھ گئی ہے۔

لیکن میں نے کبھی کبھی بلقیس کی آنکھوں میں کسی ایسے غم کو بھی کروٹیں لیتے دیکھا ہے جس سے مجھے خود اپنی کائنات الٹتی ہوئی محسوس ہوئی ہے' کبھی کبھی تو مجھے شدید تنہائی کا بھی احساس ہوا ہے' لیکن جب حامد' نجمہ اور نسرین اپنی معصوم مسکراہٹوں کے ساتھ میری طرف لپک لپک بڑھے ہیں اور بلقیس نے مجھے میرے انتہائی افسردہ لمحات میں کندھے سے جھنک کر پوچھا ہے۔ "خالد کیا بات ہے؟ تم کھوئے ہوئے کیوں ہو؟" تو میں اس وقت جیسے اس دنیا میں لوٹ لوٹ کر آتا رہا ہوں۔ اس وقت میرے دل و دماغ پر سے تنہائی اور اداسی کے بال بکھر بکھر گئے ہیں۔

جس رات ہم الٰہ آباد سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ وہ بہت سرد تھی اتنی سرد کہ اسے پوری طرح بیان کرنے کے لیے مجھے شاعری کرنی پڑے گی۔ لیکن شاعری میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ اتنا سمجھ لیجیے کہ جنوری کا آغاز ہو چکا تھا اور پچھلے دو دنوں سے ایک سخت ٹھنڈی لہر چل رہی تھی۔ ہمارے پاس پورا بستر بھی نہیں تھا' بس دو کمبل تھے جو ہم افراتفری کے عالم میں اٹھا پائے تھے۔ ایک کمبل میں حامد اور نجمہ سو رہے تھے' دوسرے میں بلقیس اور نسرین۔ میں اپنے اوور کوٹ میں ایک بند کھڑکی کے ساتھ کمر لگائے "غبارِ خاطر" پڑھ رہا تھا۔ تنہا رہ جانے والوں اور تنہائی پسندوں کا ساتھ کتابیں ہی دیا کرتی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ سگریٹ بھی بہت پیئے تھے۔ میں بہت زیادہ سگریٹ نہیں پیا کرتا لیکن اس رات سگریٹ پینے میں مجھے ایک عجیب سی فرحت مل رہی تھی۔

پڑھتے پڑھتے اور سگریٹ پیتے پیتے مجھے اقبال پور یاد آ رہا تھا۔ اقبال پور ہمارے سفر کی

منزل تھی لیکن وہاں میں اپنی خوشی سے نہیں جا رہا تھا۔ بالکل بادل ناخواستہ' آج تک وہاں جانے سے انکار کیا تھا۔ آپ کو بتایا تھا کہ وہاں ہر سال بلقیس تنہا ہی جاتی تھی' لیکن اس بار میں انکار نہیں کر سکا تھا۔ اس نے جبل پور چھوڑتے وقت میرے سامنے اقبال پور جانے کی تجویز رکھی تو میں فوراً رضامند ہو گیا۔ لیکن اس وقت وہ کسی دوسری پرسکون جگہ کا نام لیتی تو وہاں چلنے کیلئے بھی تیار ہو سکتا تھا۔ میں ہر ایسی جگہ جانے کے لیے تیار تھا جہاں پہنچ کر میرے سہمے ہوئے بچوں کی آنکھوں میں ویسی پہلی سی خوشی اور چمک لوٹ آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

اقبال پور میں ہمارا کوئی نہیں رہتا تھا۔ میرا تو وہاں کبھی کوئی عزیز رہا بھی نہیں تھا۔ بلقیس ہی کے ابا' امی' نانا' بلکہ پورا خاندان کبھی وہاں آباد تھا۔ اب تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ابا اور امی مر چکے تھے نانا بھی وہیں کی خاک میں دفن ہوئے تھے اگرچہ وہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ دینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ ان کے کئی عزیز ترک وطن کر کے سرحد پار بھی جا چکے تھے۔

بلقیس پھر بھی اقبال پور جایا کرتی تھی جہاں صرف قبریں ہی قبریں رہ گئی تھیں جن کی دیکھ بھال کرنے والا بھی اب کوئی نہیں رہا تھا۔ ہر سال برسات کی تیز بوچھاروں سے کوئی نہ کوئی قبر اچانک زمین میں دھنس کر ایک خلاء بنا دیتی تھی جس کے تصور سے بھی دل گھبراتا تھا۔ دو بار ہی وہاں جا کر میں خود کو انتہائی غمگین محسوس کرنے لگا تھا۔ وہاں مجھے کسی طرح کی آسودگی کا احساس نہیں ہوا تھا جیسا جبل پور میں ہوتا تھا جیسا اور کئی شہروں میں ہوتا تھا۔

جہاں مجھے جاننے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ اقبال پور کی دھرتی پر تو چلتے ہوئے یوں لگتا جیسے پاؤں کے نیچے جگہ جگہ گڑھے بنے ہوئے ہیں' نہ جانے میں کون سے قدم پر کس گڑھے میں اتر جاؤں گا۔

اقبال پور میں بلقیس کی ایک بہت دور کی پھوپھی رہتی تھی۔ رحمت بوا' خدا جانے وہ اس کی پھوپھی تھی بھی یا نہیں لیکن بلقیس اس کے ہاں ہمیشہ جا کر ٹھہرتی تھی۔ وہ اس قصبے کی معمر ترین عورت اسّی سال کی۔ وہ اس کے نانا دادا کے وقتوں کی تھی۔ اس کے سارے خاندان کو جانتی تھی جو آدھا زیر زمین اور آدھا پاکستان میں۔ بلقیس بھی کسی قافلے کے ساتھ وہاں چلی گئی ہوتی جیسا کہ اس کے مرحوم نانا جان چاہتے تھے۔ اس کے نانا جان تو اپنے ایک عزیز نوجوان کا انتخاب بھی کر چکے تھے جو وہاں جا کر لاہور میں آباد ہو گیا تھا۔ بلقیس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دینے کا اختیار اس کے نانا جان ہی کو حاصل تھا کیوں کہ وہ اپنے ماں باپ کی نسبت ان کے زیادہ قریب رہی تھی۔ انہوں نے ہی اسے عربی' فارسی اور اردو کی تعلیم دی تھی لیکن جب بلقیس کے

سامنے اس کی زندگی کی سب سے بڑی منزل آ گئی تو اس کے اپنے ابا سدِراہ بن گئے۔ وہ اپنی اولاد کو اسی سرزمین پر رکھنا چاہتے تھے جہاں وہ خود رہتے تھے۔ ان کا یہ ارادہ خاندان کے اندر ایک شدید اختلاف کا باعث بن گیا۔ صرف اختلاف ہی کا نہیں بلکہ بلقیس کے نانا جان کی موت کا بھی۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ جس روز میں بلقیس کو اپنی دلہن بنا کر جبل پور لے جا رہا تھا اسی روز اس کے نانا جان نے انتقال کیا۔ بلقیس جب رحمت بوا کے پاس جاتی تھی تو وہ اسے اس کے نانا جان کی بہت سی باتیں سنایا کرتی تھی۔ ان کی تمام خصلتیں جن کی وجہ سے اپنے قصبہ میں مشہور تھے۔ بلقیس کو خود بھی اپنے نانا جان کی بہت سی باتیں یاد آتی تھیں' ان کا ایک مخصوص انداز سے ہنسنا' کھانسنا' غصے ہونا' قرآن شریف پڑھنا' اور شیخ سعدی کے اشعار کی تشریح کرتے وقت اپنے اوپر ایک وجد سا طاری کر لینا۔

رحمت بوا سے ملنے کے لیے وہاں پاکستان سے کئی لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ رحمت بوا سب کی خیر خبر رکھتی تھیں۔ بلقیس جب اقبال پور سے لوٹتی تو اس کی وہی کیفیت ہوتی تھی جیسی کسی عورت کی میکے سے لوٹنے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ وہ ایک ایک عزیز کا حال سناتی۔ میں نہ پوچھتا تب بھی وہ بتا دیتی۔ کبھی کبھی لاہور چھاؤنی کے ڈپو سپروائزر کا ذکر بھی اس کی زبان پر آ جاتا تھا جو اب کئی بچوں کا باپ بن چکا تھا۔

میرا دھیان مطالعہ سے ہٹ چکا تھا۔ اقبال پور کے بارے میں سوچتے سوچتے میری نگاہیں بلقیس کے چہرے پر جمی رہ گئی تھیں۔ اس نے ایک بار کروٹ بدلی تو اس کے سر کے نیچے رکھا ہوا سیاہ برقعہ کھسک کر نیچے گر پڑا۔ میں نے برقعہ اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھنا چاہا تو اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ میری طرف چونک کر دیکھا لیکن مجھے مسکراتا ہو پا کر وہ پھر لیٹ گئی۔ پھر آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ میں نے ایک نیا سگریٹ سلگایا اور "غبارِ خاطر" کے کھلے ہوئے صفحوں پر سے وہ سطر ڈھونڈنے لگا جہاں سے میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن میں بہت دیر تک اس کتاب میں کھویا ہوا نہ رہ سکا۔ میری نظروں کے سامنے بار بار بارہ سال پہلے والی بلقیس آ کر کھڑی ہو جاتی تھی جو اس وقت ایک سولہ سترہ برس کی سیدھی سادی لڑکی تھی جس کی سب سے بڑی دل کشی اس کے چمکتے ہوئے سیاہ بالوں کی غیر معمولی درازی میں نہیں تھی بلکہ اس کے چہرے کے دل فریب نقوش میں بھی تھی جو اسے ہند میں گزشتہ سالوں سے آباد پٹھان خاندان سے ورثے میں ملے تھے۔ لیکن وہ اپنے جسم میں خیبر کے پہاڑوں جیسی بلندی اور تندی کا صرف شکوہ ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ اس کی خوبصورت آنکھوں میں شمالی وسطی میدانوں پر چھائے ہوئے آسمان کی

گہری نیلاہٹیں بھی موجود تھیں، جو کسی بھی مشرقی لڑکی کے انتہائی ذہین ہونے اور اس کے اندر شدید محبت کے جذبوں کی غماز ہوا کرتی ہیں۔ بلقیس کی آنکھوں میں جب کبھی بے چینی جھلکتی تھی تو وہ میرے حلق کی پھانس بن جاتی تھی۔ میں نے اپنے لیے جو راہیں منتخب کی تھیں میں جدھر بھی مڑ کر جس طرف بھی گیا تھا وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہی آتی تھی۔ لیکن ایسے جیسے کوئی اپنے سر پر منوں بوجھ اٹھا کر لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہو۔ آج جب میں اس کے ساتھ اقبال پور جا رہا تھا تو خود بھی لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا شاید یہ اسی شکست کا ہی احساس تھا جو میرے دل پر ایک پہاڑ جتنا بھاری بوجھ بن کر بیٹھ گیا تھا۔

اچانک کمپارٹمنٹ کی زرد اور بیمار روشنی میں، میں نے صبح کے اجالے کی کرن دیکھی جو ایک کھڑکی کے کہر آلود شیشے کے عقب میں سے جھانک رہی تھی۔ اسی وقت گاڑی ایک اسٹیشن پر اچانک رک بھی گئی تھی۔ اب اسے لکھنؤ سے پہلے کسی اسٹیشن پر نہیں رکنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ رک گئی تھی۔ میں نے سوچنا چھوڑ کر باہر کی آوازوں پر کان لگا دیے تھے۔ سخت کنکر والی زمین پر کوئی دھیرے دھیرے چلتا ہوا جا رہا تھا۔ انجن اچانک رک جانے کے بعد زور زور سے سانسیں لیتا ہوا جیسے ہانپ رہا تھا۔ جب گاڑی کئی منٹ تک نہیں چلی تو میں دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ دھند میں ڈوبا ہوا ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ اونچا پلیٹ فارم۔ چھ سات کمروں پر مشتمل ایک منزل عمارت اور دور و نزدیک کی بتیاں، سرخ سفید اور ہری ہری، ہوا چلنی بند ہو چکی تھی میرے سامنے ذرا فاصلے پر اپنے چھوٹے سے دفتر میں ایک لیمپ کے آگے رات کی ڈیوٹی والا اسٹیشن ماسٹر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں کئی منٹ تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس پورٹر کی طرف دیکھنے لگا جو گرم گرم چائے سے بھرا ہوا ایک مگ اٹھائے گارڈ کے پاس بریک کی طرف لنگڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ اس کے چلنے کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ تھوڑی دیر پہلے وہی میری بند کھڑکی کے پاس سے گزرا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے غور سے دیکھا لیکن مجھے بھاری گرم اوور کوٹ اور نیلی پگڑی میں چھپے ہوئے ایک سائے کے علاوہ کچھ نہیں دکھائی دیا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ کون سا اسٹیشن ہے؟" تو وہ رکا نہیں میری طرف دیکھے بغیر جاتے جاتے کہہ گیا "نگوہاں۔" نگوہاں کا نام سن کر میں یک بارگی جیسے چونک پڑا مجھے یقین نہیں آیا کہ اسی جگہ کا نام نگوہاں ہو سکتا تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ لکھنؤ سے پہلے نگوہاں بھی ایک اسٹیشن آتا ہے۔ دراصل ادھر سے میں جب بھی گزرا تھا گاڑی رات میں گئی تھی اور یہاں کبھی رکی بھی نہیں تھی جیسے اب اچانک رک گئی تھی۔

میں پورٹر سے مزید کچھ پوچھنے کے لیے پلیٹ فارم پر اتر گیا لیکن وہ بہت دور جا چکا تھا۔ میں نے پلیٹ فارم پر چل کر اس بات کا اطمینان کرنے کی کوشش کی کیا وہ جگہ واقعی نگوہاں ہو سکتی ہے۔ پھر اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں جاکر اس سے وہی سوال کیا۔ اس نے پورٹر کی بتائی ہوئی بات کی تائید کی تو میں نے اپنے اندر ایک عجیب سی خوش کی لہر محسوس کی جو میرے رگ وپے میں دوڑتی جا رہی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ سراٹھا کر عمارت کو غور سے دیکھا صبح کی دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی روشنی میں ایک جگہ نگوہاں لکھا ہوا بھی نظر آ گیا۔ لیکن اب یہ جگہ اتنی بدل چکی ہے پہلے تو اسٹیشن پر صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ تب یہ اونچا پلیٹ فارم بھی نہیں تھا۔ بالکل زمین کے ساتھ لگا ہوا پلیٹ فارم تھا۔ اس وقت تک میں ایک عجیب سی مسرت سے سرشار ہو چکا تھا۔ میں فوراً ڈبے میں جاکر بلقیس کو یہ خوش خبری سنا دینا چاہتا تھا کہ گاڑی نگوہاں اسٹیشن پر رکی ہوئی ہے۔

لیکن ڈبے کے اندر جانے سے پہلے مجھ پر ایک اور مسرت نے غلبہ پا لیا وہ مسرت پہلی مسرت سے کہیں زیادہ طاقت ور تھی اس نے تو مجھے پاگل کر دیا میں بھاگتا ہوا پھر اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا' میں نے اپنی جیب سے گاڑی کے ٹکٹ نکال لیے تھے سارے ٹکٹ اس کے سامنے میز پر رکھ کر پوچھا..... "کیوں صاحب! گاڑی ابھی کچھ اور دیر رکے گی؟ اور کیا ہم یہاں اتر سکتے ہیں؟ اگر ہم یہ گاڑی چھوڑ کر دن میں کسی دوسری گاڑی سے چلے جائیں تو کوئی حرج تو نہیں ہو گا؟" اس نے میرے سوالوں کا جواب سر ہلا کر اثبات میں دے دیا اور میری طرف قدرے حیرت سے دیکھتا بھی رہا میں اپنی مسرت کو اور لمحے قابو میں نہ رکھ سکا اور خوش ہو کر اس سے کہنے لگا۔

"شکریہ جناب میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں لیکن یہاں پچیس سال سے نہیں آیا ہوں۔ دیکھیے یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ گاڑی یہاں اس طرح اچانک رک گئی ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں جیسے یہ میرے لیے ہی رکی ہے۔" میں اپنے آپ ہنستا ہوا باہر چلا آیا۔ لیکن دو قدم چل کر پھر رک گیا۔ پلٹ کر پوچھا "لیکن جناب یہ کہیں چل نہ دے میرے ساتھ میرے بچے بھی ہیں۔"

"نہیں جناب آپ اطمینان سے اتر سکتے ہیں آگے سے ایک اور گاڑی آ رہی ہے۔"

میرے منہ سے ایک لمبی سی اوہ نکلی اور میں بھاگتا ہوا سا اپنے ڈبے میں جا پہنچا۔ بلقیس چند لمحے پہلے ہی جاگی تھی اور وہ مجھے اپنے پاس نہ پاکر اور دروازے کو کھلا ہوا دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

میں نے ایک عجیب سی وارفتگی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اس کے گالوں پر رکھ دیے جنہیں اس نے ایک جھٹکے سے پرے ہٹا دیا کیوں کہ اس ڈبے میں دوسرے مسافر بھی سوئے ہوئے تھے۔ لیکن میں نے اپنی غلطی کی کوئی پروانہ نہ کرتے ہوئے اس سے کہا "بلقیس جلدی سے بچوں کو جگا دو۔ ہم یہیں اتریں گے اسی اسٹیشن پر۔ لیکن دیر مت کرو۔ یہ گاڑی ایک دوسری گاڑی سے کراس کرنے کے لیے رکی ہوئی ہے اس کے بعد فوراً چل دے گی۔"

میں خود ہی بچوں کو جگانے لگا ایک ایک کو آہستہ آہستہ ہلایا اور پکارا اور شاید بلقیس میری مسرت کا ذرا سا بھی اندازہ نہیں کر سکی تھی وہاں اچانک اتر پڑنے کی خبر سن کر وہ گھبرا سی گئی تھی، جلدی سے پاس لیٹی ہوئی نسرین کو سینے سے لگا کر پوچھنے لگی "ہائے اللہ! کیا خیر تو ہے۔"

اس کا اس قدر گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر میری پھوٹتی ہوئی ہنسی غائب ہو گئی۔ یکسر غائب ہو گئی۔ مجھ پر افسردگی چھا گئی۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی کتنی تیزی سے دوڑتا پھرتا تھا۔ اس وقت میرے پاؤں میں زنجیریں سی پڑ گئیں۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں رکا رہ گیا۔ کچھ لمحوں تک بلقیس کی آنکھوں میں گھورتا رہا۔ انہی آنکھوں میں جو جبل پور سے نکلتے وقت انتہائی خطروں کے باوجود ایک دبی دبی فتح کے احساس سے چمک اٹھی تھیں۔ لیکن اب ان میں کوئی چمک نہیں تھی۔ ان میں صرف خوف ہی خوف تھا۔

لیکن میں چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سنبھل گیا جب سنبھلا تو مجھے اپنی خوشی واپس آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بدن میں پھر سے طاقت عود کر آئی۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آگے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم اپنی مرضی سے یہاں اتریں گے اپنی خوشی سے پھر چل دیں گے۔ خطرہ تو بس وہیں تک تھا جہاں سے ہم چلے تھے۔"

ہم سب گاڑی سے نیچے اتر گئے۔ حامد اور نجمہ اپنے کوٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر گاڑی کے پہیوں کے نیچے سے ادھر دوسری طرف جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھنے لگے تھے۔ نسرین بلقیس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ بلقیس نے اسے سردی سے بچانے کے لیے اپنا برقعہ پھیلا دیا تھا۔ میں دونوں کمبل اور ایک اٹیچی کیس اٹھائے ویٹنگ روم کی طرف بڑھا۔ بلقیس بچوں کو ساتھ ساتھ نہ چلنے کے لیے سرزنش کرنے لگی۔

کچھ ہی دیر کے بعد دن کا اجالا ہر طرف پھیل گیا۔ بلقیس وہاں اتر جانے کی وجہ سے اب تک برہم تھی اور بید سے بنے ہوئے ایک چوڑے سے بنچ پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی تھی۔ حامد اور نجمہ باہر پلیٹ فارم پر گھومتے پھرتے تھے۔ ننھی نسرین دروازے کی جالی کے پیچھے کھڑی ہو کر

حیرت سے جھانک رہی تھی۔

اچانک حامد نے باہر آنے کے لیے پکارا میں باہر گیا تو وہ حیران ہو کر مجھ سے اس پورٹر کی طرف دیکھنے کے لیے کہنے لگا جو گلے میں بجھے ہوئے سگنلوں کی بتیوں کا ہار ڈالے دونوں ہاتھوں میں مٹی کے تیل کی ادھ بھری بوتلیں اٹھائے لنگڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ وہی پورٹر تھا جو مجھے صبح کے دھندلکے میں ملا تھا۔ اس وقت اس نے اپنا چہرہ سردی سے بچنے کے لیے پگڑی سے چھپا رکھا تھا۔ اب میں اسے صاف دیکھ سکتا تھا وہ بھی میری طرف دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا ہم ایک دوسرے پر سے نگاہیں نہ ہٹا سکے وہ بالکل قریب آ گیا تو وہ "کھالد بھائی" کہہ کر رک سا گیا۔ صرف چند ہی قدم دور اس بات کا یقین کرنے کے لیے کہ میں سچ مچ خالد ہی تھا!

میں اسے "ارے تم ہو رام داس!" کہہ کر خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اسے بجھی ہوئی بتیوں کے ہار سمیت ہی گلے سے لگا لیا۔ مجھ سے اس قدر اچانک مل کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے' کئی روز سے اگی ہوئی ملگجی ڈاڑھی میں چھپی ہوئی سانولی جلد چمکنے لگی۔ میں پوچھا..... "یہ تم لنگڑاتے ہوئے کیوں چل رہے ہو۔"

اس نے جواب دیا "جوڑوں کے درد نے یہ حال کر رکھا ہے تم اپنی کہو کھالد بھائی! آج ادھر کیسے بھول پڑے؟ جان پڑت ہے کہیں اپھسر ضرور ہو گئے ہو۔ کیوں گلط تو نہیں کہا میں نے؟" یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑا۔ میں نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک بار پھر گلے لگا لیا اور پھر رندھے ہوئے گلے سے اپنے بچوں کو بتایا "جانتے ہو یہ کون ہے؟ میرا بچپن کا دوست' ہم دونوں اسی گاؤں میں کھیلے ہیں۔ وہ سامنے جو بہت سارے مکان دکھائی دے رہے ہیں وہی ہمارا گاؤں ہے وہاں کی ہر گلی..... ہر گلی کا چپہ چپہ ہمارے گزرے ہوئے زمانے کی گواہی دے گا کیوں رام داس؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو بتیوں کا ہار بج اٹھا' بچے مسکرانے لگے۔ رام داس نے ہم سب کو اپنے ہاتھ سے بنا کر چائے پلائی اسٹیشن کے پاس ایک چھوٹی سی بجریا میں جا کر گرم جلیبیاں بھی لے آیا۔ پھر ہم سب گاؤں دیکھنے کے لیے چل دیے۔ میں انہیں اپنا گاؤں دکھانے میں فخر محسوس کر رہا تھا بچے بھی خوش اور پرجوش تھے کہ اس گاؤں میں ان کا ابو کبھی انہی کی عمر کے بچوں کی طرح پھرتا رہا تھا۔ بچوں کو جب اپنے ماں باپ کے بچپن کی باتوں کا علم ہوتا ہے تو وہ حیران بھی ہوتے ہیں اور خوش بھی۔ میں اپنے بچوں کی حیرت اور خوشی کی کیفیت سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بہت لطف آتا ہے' انہیں چھیڑنے میں' عجیب

و غریب باتیں سنا سنا کے حیران کر دینے میں اور کوئی ایسی بات کرنے میں جس پر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں' میں بچوں کو خوش رکھنے کے سارے ڈھنگ بھی جانتا ہوں' انہیں زور زور سے ہنستا ہوا دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ارد گرد رنگ برنگ کے مہکتے ہوئے پھولوں والے کئی گلزار کھل گئے ہیں۔

ہمارے ساتھ بلقیس بھی تھی۔ چہرے سے نقاب اٹھائے چپ چاپ ساتھ دے رہی تھی' نہ ہنستی تھی نہ مسکراتی تھی نہ ہی کوئی بات پوچھتی تھی' میں نے جب اپنے بچپن کے دوستوں کے عجیب عجیب نام شبو' نوابو' گورشرنی' رام بھجو' وغیرہ سنائے تو بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے لیکن بلقیس کے چہرے پر بس ایک طنز ہی ابھر سکا۔

اب تو گاؤں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا اس بڑے میدان میں جو اسٹیشن اور گاؤں کے بیچ خالی پڑا رہتا تھا اور جہاں ہم دوڑیں لگایا کرتے تھے اب کئی مکان بن چکے تھے وہاں وہ پانی کا تالاب بھی دکھائی نہ دیا جس میں ایک عید کے موقع پر مجھے ایک لڑکے نے دھکا دے کر گرا دیا تھا اور میرے نئے کپڑے بھیگ گئے تھے اور جب میں گھر پہنچا تھا تو مجھے میرے ابا نے خوب پیٹا تھا۔ میرے اس طرح پٹنے کی بات سن کر حامد نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور پوچھا..... "اچھا ابو یہ بتایئے آپ کو آپ کے ابو نے کس طرح پیٹا تھا؟"

"جس طرح پیٹا جاتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے چھڑی سے یا تھپڑوں سے۔"

"اس طرح تھپڑوں سے۔" میں نے ہنستے ہوئے اس کے گال کو تھپتھپا بھی دیا۔ نجمہ بولی..... "لیکن ابو آپ تو ہمیں کبھی نہیں مارتے؟"

میں نے مسکرا کر بلقیس کی طرف دیکھا اور شرارت سے کہا "میری بجائے تمہیں تمہاری امی جو مارا کرتی ہیں۔"

بلقیس تب بھی نہیں مسکرائی' نجمہ اپنی ماں کے ساتھ جا لگی اور بولی "کہاں مارا کرتی ہیں امی' یہ تو ہمیں پیار کرتی ہیں۔"

میں انہیں اپنا مکان بھی دکھانا چاہتا تھا جسے پچیس برس پہلے میرے والد نے اپنی تنگ دستی کی وجہ سے بیچ دیا تھا کیوں کہ وہ مجھے ہائی اسکول اور کالج کی تعلیم دلانا چاہتے تھے' لیکن جب وہاں پہنچے تو وہاں ایک دوسرا ہی مکان تعمیر ہو چکا تھا جس کے مکین تک ہمیں نہیں پہچانتے تھے' وہاں ہمیں ابھی تک رام داس کے سوا کسی نے بھی نہیں پہچانا تھا۔ وہاں کوئی ایسا شخص تھا بھی

نہیں۔ وہاں کی بیشتر آبادی اگر وہیں پر دوکان داری یا کھیتی باڑی نہیں کرتی تھی تو پھر آس پاس ضلعوں کے صدر مقاموں پر جاکر کارخانوں میں نوکری کر کے یا سڑکوں پر رکشا چلا کر اپنا پیٹ پالتی تھی۔ میں اپنی ہی گلیوں میں اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا مسجد کے سامنے رک کر میں نے اس امام کو یاد کیا جس نے مجھے نماز پڑھنا سکھایا تھا' اپنے زمانے کے پرائمری اسکول میں پہنچ کر اسی کمرے کے کونے کو تلاش کیا جہاں بیٹھ کر میں پڑھتا تھا اور اسکول سے ملا ہوا کام نہ کرنے کی وجہ سے اپنے استاد کے سامنے مرغا بن کر سزا پایا کرتا تھا۔ اب وہ ہائی اسکول بن گیا تھا۔

میں جہاں جہاں گیا بچے میرے ساتھ خوش خوش گھومتے رہے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا بچپن پھر واپس آگیا ہے اور ایک بچے کی شبیہہ اختیار کر کے میرے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔

ہم لوگ گھومتے پھرتے ریلوے لائن کے پاس جا پہنچے' اب ہم اسٹیشن کے دوسرے سرے پر تھے' شمالی سرے پر جدھر لکھنؤ تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میرے اندر ایک عجیب سا اضطراب پیدا ہو گیا ایک بھولی بسری ہوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ وہاں ریلوے لائن کے سامنے ذرا فاصلے پر آم کا پیڑ تھا اس پیڑ کے سامنے ریلوے لائن خم کھا جاتی تھی۔ لیکن وہاں نہ وہ پیڑ دکھائی دیتا تھا نہ ہی وہ لائن کا خم.....

"ابو آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔" بچوں نے بھی بڑے اضطراب سے مجھ سے پوچھا۔ میں انہیں بتانے لگا۔ "جب میں یہاں رہتا تھا تو میرے پاس ایک بہت ہی خوبصورت کتا تھا۔ چھوٹا سا' اتنا چھوٹا کہ جب چلتا تو بالکل زمین کے ساتھ لگا ہوا معلوم ہوتا اس کے جسم پر گہرے بھورے رنگ کے لمبے لمبے چمک دار بال تھا' جو اس کے منہ پر اگے ہوئے تھے' اس کی آنکھوں پر بھی گر گر پڑتے تھے اس کی پیاری پیاری آنکھیں تھیں ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کتنی کتنی دیر تک دیکھتے رہتے تھے۔"

"اس کا نام کیا تھا ابو؟"

"ٹپی۔"

"ٹپی! بہت ہی پیارا نام ہے۔"

"اب وہ کہاں ہے ابو؟"

"وہ آپ نے لیا کہاں سے تھا ابو؟"

"میرے ابا کو ایک انگریز افسر دے گیا تھا اسی انگریز کی میرے ابا نے بہت خدمت کی تھی۔ میرے ابا نے وہ کتا میرے ہی لیے اس سے مانگا تھا' بہت ہی قیمتی تھا وہ! لیکن اس انگریز

نے میرے ابا کو دے ہی دیا تھا' ہپی پھر میرا دوست بن گیا۔ پہلے مجھ پر بہت بھونکتا تھا۔ پھر مجھ سے پیار کرنے لگا۔ ہر وقت میرے پاؤں چاٹتا تھا۔ میری سیٹی کی آواز سنتے ہی بھاگا ہوا آتا تھا میں کھیلنے کے لیے کہیں جاتا تو وہ میرے ساتھ ساتھ ہی رہتا تھا۔ میں نے اس کے گلے میں گھنگھرو باندھ رکھے تھے وہ بھاگتا تو گھنگھرو بہت ہی مزے سے بجتے تھے چھن چھن چھن' چھن چھن چھن!!"

بچوں کی مسکراہٹیں چوڑی ہوتی گئیں آنکھوں کی چمک بڑھتی گئی۔ بلقیس ہمارے قریب ہی تھک کر لائن پر بیٹھ گئی تھی' میں بچوں کے سامنے کھڑا اپنی کہانی سنا رہا تھا۔

" ہپی کو میں نے گیند اٹھا لانا بھی سکھا دیا تھا جب ہم گلی ڈنڈا کھیلتے تو وہ بھاگ کر اپنے آپ ہی گلی اٹھا کر لے آتا تھا' رفتہ رفتہ میں نے اپنی کتابوں کا بستہ اٹھانا بھی سکھا دیا۔ جب میں لکھنؤ کے ایک مڈل اسکول میں پڑھنے کے لیے روزانہ گاڑی سے جانے لگا تو ہپی میرا بستہ اٹھا کر اسٹیشن ضرور آتا تھا وہاں میں اس سے بستہ لے کر گاڑی میں چڑھ جاتا۔ گاڑی چل پڑتی تو گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگتا' وہ کچھ دور تک ہی بھاگ پاتا تھا۔ پھر گاڑی تیز ہو جاتی' وہ ایک موڑ تک پہنچ کر رک جاتا تھا گاڑی چلی جاتی تو وہ گھر لوٹ جاتا....."

"ایک دن ہم گاڑی میں بیٹھے ہوئے اسے ہپی' ہپی کہتے ہوئے جا رہے تھے وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ خوشی سے اچھلتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ہم زور زور سے پکارتے رہے وہ اور تیز بھاگنے کی کوشش کرتا تھا' جب گاڑی لائن کے موڑ سے گھومنے لگی تو اس نے بھی گھوم کر ساتھ دینا چاہا لیکن وہ موڑ بہت ہی خطرناک تھا تیزی سے بھاگ کر آتا ہوا وہاں کوئی بھی آدمی گاڑی کے نیچے آسکتا تھا' اس دن ہپی جب موڑ سے نکلنے لگا' اچانک گاڑی کے نیچے آگیا۔" یہ سن کر بچوں کے منہ کھلے رہ گئے۔

میں نے بتایا "وہ گاڑی کے نیچے کٹ گیا ہم لوگوں نے گاڑی کی زنجیر کھینچ لی۔ زنجیر کھینچنے سے گاڑی رک گئی' ہم لوگ نیچے اتر آئے ہپی کٹ چکا تھا' مر چکا تھا' پتھروں اور کوئلوں پر اس کے گرم خون کا جیسے چھڑکاؤ سا ہو گیا تھا اسے مرا ہوا دیکھ کر میں دھاڑیں مار مار کر رو پڑا تھا۔"

"پھر؟ پھر ابو؟" حامد کے گلے سے بمشکل آواز نکلی نجمہ کا حلق بھی سوکھ گیا تھا۔ وہ کچھ بول ہی نہ پائی' نسرین سہمی ہوئی نظروں سے مجھے گھورے جا رہی تھی' پہلی بار بڑی دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی' میں نے انہیں بتایا۔

"اس کے بعد ہم لوگ ہپی کے کٹے ہوئے جسم کے حصے اکٹھے کر کے پیڑ کے نیچے لے

گئے وہاں ہم نے مل کر ایک گڑھا کھودا' پپی کو اس میں لٹا کر اس پر بہت سی مٹی ڈال دی' گڑھا بھرنے کے بعد اس پر بہت سے پتھر رکھ دیے وہ ہمارے ایک بہت ہی پیارے دوست کی قبر تھی' ہم پڑھنے کے لیے لکھنؤ جاتے تھے تو اس کی قبر کی طرف ایک نظر دیکھنا کبھی نہیں بھولتے تھے۔"

"ابو اس کی قبر اب کہاں ہے؟"

قبر تو اب کہیں بھی نہیں تھی اس کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا صرف یاد باقی رہ گئی تھی! ادھر ادھر دیکھ کر پپی کی قبر تلاش کرتے وقت اچانک میری نظریں بلقیس کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی' اس کی آنکھوں میں میرے تجسس اور اضطراب کے لیے بھرپور تائید تھی' تائید اور ہمدردی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک مغموم سی مسکراہٹ ابھری' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میری پاس آ گئی۔ میرے بازو کو پکڑ کر آہستہ سے بولی "کیا آپ چاہتے ہیں ہم لوگ کچھ روز یہاں رہیں۔؟"

جب ہم نہ ہوں گے

بشیشر پردیپ

یہ گرم کوٹ اس کے مرحوم شوہر کا تھا۔ پچھلی سردیوں میں وہ یہ گرم کوٹ پہنا کرتا تھا۔ ویسے یہ گرم کوٹ تقریباً آٹھ سال پرانا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد یہ پہلا اور آخری کوٹ تھا جو اس کے شوہر نے بنوایا تھا۔ اس نے متواتر آٹھ سردیاں اسے پہنا تھا اور اب اس کا رنگ بھی ہلکا پڑ گیا تھا۔ تین چار جگہ سے سلا ہوا تھا۔ دو تین جگہ سے رفو کیا ہوا تھا۔ اور یہ مرمت وہ گاہے بگاہے خود کرتی رہی تھی۔ اس وقت تین بٹنوں میں سے صرف ایک بٹن لگانا تھا لیکن اسے بٹن ہی نہ ملے۔ اور اب ان سردیوں میں وہ خود یہاں نہیں ہے۔ وہ جو اسے پہنا کرتا تھا۔ اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ کبھی نہیں۔!!

اس کے بوڑھے سینے کے اندر دھڑکتے دل کو جیسے کسی نے زور سے مسل دیا ہو۔ اس کے سوکھے ہونٹ پھڑ پھڑا اٹھے۔ ان میں سے ایک لمبی سرد آہ نکلی اور اس کی بوڑھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چیر کی سی ان آنکھوں کے کونوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نمودار ہوئے اور اس نے شدت کرب سے آنکھیں بند کیں تو دو قطرے وہاں سے نکل کر اس کے جھرّیوں بھرے گالوں پر بہتے چلے گئے۔

وہ اوپر والے کمرے میں رکھے بڑے ٹرنک میں سے کپڑے نکال رہی تھی۔ اپنے نوزائیدہ پوتے کے لیے اترے ہوئے سوئٹر کی تلاش میں کپڑے نکالتے ہوئے اچانک ٹرنک کے ایک کونے میں سے یہ بوسیدہ گرم کوٹ نکل آیا تھا۔ اور اس کوٹ نے اسے اس کے شوہر کی یاد دلا دی تھی..... اس کی نظروں کے سامنے اپنے شوہر کا چہرہ گھوم گیا۔ جھرّیوں بھرا، کمزور سا چہرہ۔

بڑھی ہوئی سفید ڈاڑھی' سر پر چاروں طرف چھدرے سے سفید بال' بیچ میں تو اس کا سر بالکل خالی تھا اور وہاں کی زردی مائل کھال تیل لگانے سے چمکنے لگتی تھی۔ پچھلی سردیوں میں وہ پینسٹھ سال کا تھا اور اس کی اپنی عمر اس وقت ساٹھ سال کی تھی۔ چالیس سال! کتنا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ چالیس سال! لیکن کتنا تھوڑا سا لگتا ہے۔ اس وقت چالیس سال کا وہ تمام عرصہ یک بارگی اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اتنا لمبا عرصہ سمٹ کر اس ایک لمحے میں سما گیا۔ چالیس سال کی اکٹھی زندگی کی جھانکیاں بڑی تیزی' بغیر کسی ترتیب کے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئیں۔ اور پھر اس کے بعد ایک وقفہ سا آ گیا۔ جیسے اس کے ذہن کا پردہ اچانک خالی ہو گیا ہو۔ فلم کے انٹرول میں سینما کے پردے کی طرح۔ وہ کوٹ لیے پاس پڑے ایک چھوٹے سے ٹرنک پر بیٹھ گئی..... اداس سی' نڈھال سی' کھوئی ہوئی سی۔ وہی جھانکیاں اسے پھر نظر آنے لگیں..... لیکن اب کی بار یہ جھانکیاں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں..... یہ اس کی شادی کا دن تھا وہ دلہن بنی تھی اور وہ اسے بیاہنے آیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ لیکن یہ کل تو گزر گیا تھا..... اور "کل" جب گزر جاتا ہے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا چاہے اسے گزرے ہوئے چوبیس ہی گھنٹے کیوں نہ ہوئے ہوں۔ سہیلیوں کا جھرمٹ۔ شادی کا ہنگامہ..... بارات کے آنے کا شور..... ماں باپ کے گھر سے اس کی وداعی۔ نیا گھر..... سہاگ رات..... سب ہی کچھ تو اسے یاد ہے..... ایک بات بھی تو وہ نہیں بھولی..... بات گزر جاتی ہے..... لیکن اس کی یاد رہ جاتی ہے۔ جانے کیوں.....؟

شادی کے بعد وہ اسے کتنا پیار کرتا تھا..... کہا کرتا تھا.....

"جمنا..... ہم دونوں ساتھ ہی جئیں گے' ساتھ ہی مریں گے"..... اس سے جدائی کا خیال بھی اسے اداس کر دیتا تھا۔ جب بھی وہ میکے جانے کے لیے تیار ہوتی' وہ آنکھوں میں آنسو بھر لیتا اور پھر وہ بھی زیادہ عرصہ میکے میں نہ رہ سکتی۔ چند ہی روز بعد لوٹ آیا کرتی۔ لیکن ان تھوڑے سے دنوں میں بھی وہ اسے کتنے ہی خط لکھ ڈالتا تھا۔ لمبے لمبے خط..... وہ تو زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی۔ کتنی ہی دیر لگ جاتی اسے خط پڑھنے میں' وہ مشکل سے تھوڑا سا لکھ پاتی۔ صرف ایک دو خط ہی لکھتی تھی وہ۔ اور وہ اسے ہمیشہ جتایا کرتا۔

"تمہارے دل میں تو میرے لیے پیار ہے ہی نہیں..... ورنہ ہر خط کا جواب نہ دیتیں۔"

اور وہ صرف ہنس کر رہ جاتی۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ اف!! اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور اس نے تکلیف اور درد سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ان گزرے دنوں کی یاد کو ذہن سے پرے رکھنے کی کوشش کی لیکن یاد تھی کہ دماغ میں گھسی چلی آرہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر یادوں کے بس میں تھی۔

شادی کے پورے ڈیڑھ سال بعد ان کا بچہ پیدا ہوا۔ ان کا پہلا بچہ۔ ہوبہو باپ کی شکل کا تھا وہ۔ جب وہ اسے گود میں لے کر بیٹھتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ خود چھوٹا سا' ننھا سا بچہ بن کر اس کی گود میں آ بیٹھا ہو۔ اور اس خیال کے آتے ہی وہ بچہ کا منہ چوم لیتی۔ اسے بے تحاشہ چومنے لگتی۔ اس کو بھی تو بہت پیارا لگتا تھا وہ۔ جب کبھی بیمار ہوتا تو وہ کھانا پینا بھول جاتا۔ کام پر بھی نہ جاتا۔ ڈاکٹروں کے چکر پر چکر لگایا کرتا۔ رات کو اٹھ اٹھ کر اس کو دیکھتا۔ وہ بچہ تھا بھی تو بہت پیارا۔ منا منا سا۔ پیار سے وہ اسے "بھولا" کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ اس کا نام تو ابھی رکھا ہی نہ تھا..... اس کی گود میں پڑا ہوا بھی ٹیاؤں ٹیاؤں کیا کرتا۔ روتا بہت تھا وہ..... ارے وہی بھولا جواب ان کا بڑا لڑکا ہے۔ جو کالج میں پروفیسر ہے۔ پروفیسر دینانا تھ..... جس کا اب اپنا تیسرا بچہ پیدا ہوا ہے۔ ہاں وہی۔ جو بات بات پر اسے کہتا ہے "تم تو سمجھتی ہی نہیں ماں۔" جو باپ کو کہتا تھا۔ "تم خواہ مخواہ دخل اندازی کرتے ہو باپو۔ تم چپ چاپ پڑے رہا کرو۔" یہ لڑکے جب بڑے ہو جاتے ہیں۔ پڑھ لکھ جاتے ہیں تو اپنے ماں باپ کو بے وقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ انہ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے شوہر نے اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لیے اپنی زمین بیچ دی تھی۔ ہر بار جب اسے انکی تعلیم کے لیے ضرورت ہوتی تو وہ زمین کا کوئی ٹکڑا بیچ دیتا اور اسے بتاتا بھی نہ تھا وہ سوچتا..... یہ بات اس کو کیا بتانی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ جان جاتی اور جاننے کے بعد وہ دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے وہ اپنی جائداد کی بھی پرواہ نہیں کر رہا تھا۔ اس نے تو یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہی لڑکے بڑے ہو کر اپنی اپنی جائداد بنانے کی فکر میں ماں باپ کی خوشیوں کی بھی پروانہ نہ کریں گے۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بے اختیار سی ہو کر زانو پر رکھے کوٹ میں اپنا منہ چھپا لیا۔ کوٹ میں اسے ایک جانی پہچانی سی خوشبو آئی۔ اس کے مرنے کے بعد وہ کوٹ دھلوایا نہیں گیا تھا۔ اس میں رچی بسی خوشبو اب بھی آ رہی تھی۔ وہ کتنی دیر کوٹ میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا شوہر کوٹ پہن کر کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہوا ہے۔ جاتی بار

وہ اس کی طرف اپنے بازو پھیلا دیتا ہے اور وہ اس کے بازوؤں میں سما جاتی ہے۔ اس کے سینے میں منہ چھپا لیتی ہے۔ اس کے نتھنوں میں اس کے شوہر کی خوشبو گھس جاتی ہے۔ لیکن ایسا تو اس کوٹ کے سلوانے کے بعد کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ تو اس کوٹ سے پہلے والے کوٹ بلکہ اس سے بھی پہلے والے کوٹوں کے وقتوں کی بات ہے۔ کوٹ پر کوٹ بدلتے گئے اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ان کے بچے جو بڑے ہو گئے تھے۔

اس نے ایک لمبی سانس لی اور بے بس سی ہو کر کوٹ پر سے منہ ہٹا لیا اب وہ ہتھیلی پر چہرہ ٹکائے سامنے دیکھ رہی تھی بدستور یادوں میں ڈوبی ہوئی۔ نیچے سے اس کے پوتے کے رونے کی آواز آئی لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ اسے یہ آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ان یادوں کے پس منظر سے..... اور اس نے اس ہلکی سی بے معنی سی آواز کی طرف کوئی دھیان نہ دیا..... اگر وہ اس وقت نیچے ہوتی تو اسے اپنے روتے ہوئے پوتے کو گود میں اٹھا لینا پڑتا۔ اس کی بہو اس سے یہی امید کرتی تھی۔ اور اس وقت وہ یادوں میں نہ کھوئی ہوئی ہوتی تو پوتے کو اوپر سے چمکار ہی دیتی یا نیچے ہی چلی جاتی۔ لیکن اب وہ اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت کمرے میں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اس کا شوہر اگرچہ سبھاؤ کا بہت نرم تھا لیکن کبھی کبھی اسے بہت غصہ آتا تھا۔ اور جب اسے غصہ آتا تھا تو وہ آگے پیچھے نہیں دیکھتا تھا۔ جو لوگ کبھی کبھار غصہ میں آتے ہیں۔ ان کا غصہ بہت تیز ہوتا ہے۔ غصہ میں آکر تو ایک بار اس نے روٹی کی تھالی پھینک دی تھی۔ بات کیا تھی یہی نا کہ ترکاری مزے دار نہیں بنی تھی۔ اس نے جب یہ بات بتائی تو وہ اس کا سبب سبزی کا خراب ہونا بتانے لگی..... اور وہ چڑ گیا۔ کہنے لگا "تم اپنا قصور مانتی ہی نہیں ہو۔ اپنی غلطی میرے سر مڑھتی ہو..... مجھ سے نہیں کھائی جاتی۔ کتوں کو ڈال دو۔"

اور اس نے تھالی اٹھا کر باہر پھینک دی۔ وہ بالکل کچھ نہ بولی..... اور تھوڑی دیر بعد فضا صاف ہو گئی تھی۔ جب بھی اسے غصہ آتا تھا وہ خاموش ہو جایا کرتی تھی ورنہ بات بڑھ سکتی تھی۔ جب وہ جانتی تھی کہ اس کا غصہ عارضی تھا تو وہ بات کا جواب دے کر بات کیوں بڑھاتی؟ اور پھر وہ اس کو چاہتا بھی بہت تھا۔ زبردستی اسے پھل کھلاتا جب کبھی وہ بیمار پڑتی وہ بے قرار ہو جاتا۔ ایک دن جب وہ سخت بیمار ہوئی تھی یعنی جب اس کا دوسرا لڑکا پیدا ہوا تھا جو سیکریٹریٹ میں ملازم ہے تو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اس وقت وہ اس کی چارپائی کے پاس بیٹھا چپکے چپکے آنسو بہایا کرتا تھا۔ اس نے غنودگی کے عالم میں اسے اسکی ماں سے یعنی اپنی ساس

سے کہتے سنا تھا "اگرچہ جمنا کو کچھ ہو گیا تو میں یہ دنیا ہی چھوڑ دوں گا۔ جنگل میں چلا جاؤں گا۔ ویرانوں میں زندگی گزاروں گا۔ تم ان بچوں کو سنبھال لینا۔"

لیکن وہ نہ مری اب اس کے بعد پینتیس سال گزر چکے ہیں اور وہ ابھی زندہ ہے اور وہ خود اس سے پہلے چل بسا۔

کتنی عجیب بات ہے۔ جب وہ اس سے دور چلا جاتا تھا' دفتر کے کسی کام کے سلسلے میں' تو وہ کس بے صبری سے انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن اب..... اب نہ جانے وہ کس کام سے چلا گیا ہے..... اس کا یہ کام تو کبھی ختم نہ ہو گا..... کبھی نہیں..... وہ کبھی واپس نہ آئے گا..... کبھی نہیں.....

اور اس کا دل بھر آیا۔ ایک بار پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ایک بار پھر اس کے گالوں پر آنسو بہنے لگے..... اس نے چند لمحے اسے بہنے دیا۔ پھر اس نے اپنی سوکھی ہوئی انگلیوں سے گالوں کو پونچھا۔ ناک کو صاف کیا۔ آنکھوں کو خشک کیا اور پھر یادوں میں کھو گئی۔

اس نے ہمیشہ اچھے دن کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن اچھے دن کبھی نہ آئے۔ وہ تمام عمر کلرک ہی رہا۔ حتیٰ کہ پنشن پا گیا۔ پچاس روپیہ ماہوار پنشن۔ ہاں البتہ اس کے بیٹے ضرور امیر ہیں۔ لیکن انہیں کیا.....؟ امیر بیٹوں کے والدین ہوتے ہوئے بھی' ان کے پاس رہتے ہوئے بھی' وہ خود غریب تھے۔ بیٹوں پر جو دار و مدار رکھتے تھے۔ اپنی مرضی کے مطابق کبھی شادی یا تہوار پر خرچ نہ کر سکتے تھے۔ اب یہی چھوٹی بیٹی کی شادی پر اس کی کتنی چاہ تھی کہ اسے اچھا جہیز دے تاکہ اس کی بیٹی سسرال میں اپنا سر اونچا رکھ سکے۔ فخر سے کہہ سکے کہ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی اس نے اپنی حیثیت کے مطابق بہت اچھی طرح کی تھی۔ لیکن اب اس کے بیٹوں نے اپنی مرضی کے مطابق خرچ کیا اور وہ خاموش دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ ریٹائر ہو چکا تھا صرف پنشن ہی اس کی ذاتی آمدنی تھی۔ وہ کرتا بھی کیا؟ اور اب اس کی لڑکی دکھی ہے۔ وہ لوگ اسے طعنے دیتے ہیں۔ بڑے گھر کی کنجوسی کے طعنے۔ لیکن اب اس کے بیٹوں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی جیسے وہ انکی بہن ہی نہ ہو۔ ایسی باتوں سے اسے کتنا دکھ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اس دکھ سے' سوچوں سے نڈھال ہو جاتا تھا۔ جب ہی تو اس کی صحت جلد خراب ہو گئی تھی اور وہ چارپائی پر پڑ گیا۔ بیٹوں کے خوش حال ہونے سے اپنی خوش حالی میں فرق نہ پڑے تو کیا فائدہ ایسی اولاد سے۔

وہ بیماری میں کہا کرتا تھا۔ "میرے مرنے کے بعد یہ پچاس روپیہ ماہوار کی پنشن بھی بند ہو

جائے گی۔ تمہاری تو مٹی خراب ہو جائے گی جمنا۔"

اور وہ اس کو دلاسا دیتی۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔" لیکن وہ ٹھیک نہ ہوا۔ اس کی صحت گرتی گئی۔ تین سال متواتر بیمار رہا۔ بہویں تو جیسے اس کی بیماری سے تنگ آ گئی تھیں۔ اس کی کھانسی سے جب ان لوگوں کی نیند کھل جاتی تھی تو کیسے بڑبڑاتی تھیں وہ.....؟ ہے بھگوان جیسے ان کو تو بڑھاپا آئے گا ہی نہیں۔ کچھ بیماری کی وجہ سے' کچھ بہوؤں کے سلوک کی وجہ سے اور کچھ لڑکوں کی طرف سے خرچ میں کنجوسی کی وجہ سے وہ اکثر بلبلا اٹھتا۔

"اب تو بھگوان مجھے اٹھا ہی لے تو اچھا ہے۔"

اور اس کی بڑھتی ہوئی تکلیف کو دیکھ کر وہ بھی سوچا کرتی۔

"اب اس کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ اس تکلیف پانے سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ ختم ہو جائے۔"

ہاں وہ یہی سوچا کرتی تھی۔ وہ جو اس کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ وہ جو دنیا میں صرف اسی کو اپنا ساتھی تصور کرتی تھی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ وہ مر جائے..... اف وہ یہ کیا سوچتی تھی؟ لیکن کرتی بھی کیا.....؟ اس سے اس کی تکلیف جو نہ دیکھی جاتی تھی۔ وہ اس کی خدمت کرنے سے تھوڑی گھبراتی تھی۔ جب وہ متواتر چار ماہ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑا رہا تو وہ کس باقاعدگی سے دونوں وقت اس کے پاس جاتی تھی۔ کسی دن تو پیدل ہی اتنی دور..... رکشہ کے پیسے بچانے کے لیے۔ ان بچائے ہوئے پیسوں سے اس کے لیے کوئی پھل خریدنے کے لیے۔ بیماری کے دنوں میں وہ چڑچڑا بھی تو کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ چڑچڑا اور ضدی۔ جان بوجھ کر ایسا کام کرتا جس سے تکلیف بڑھ جائے۔ ڈاکٹر نے ٹھنڈی تاثیر کی چیزیں کھانے کو منع کیا تھا۔ اور اس نے جانے کس طرح گنے کا رس منگوا کر پی لیا اور اس سے اس کی تکلیف بڑھ گئی۔ اس وقت غصہ میں اس نے بھی تو اسے برا بھلا کہا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ بیماری اور دل میں چھپے درد کی وجہ سے وہ اس طرح کے کام کرتا ہے جیسے کسی سے بدلہ لے رہا ہو۔ اپنے بیٹوں سے' اپنی بہوؤں سے' اپنے ارد گرد سب سے بدلہ.....!

اور اب تو اسے یہ دنیا چھوڑے ہوئے بھی ایک سال ہو رہا ہے۔ گھر کے دوسرے افراد کو تو جیسے کچھ فرق ہی معلوم نہیں ہو گا۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تنہا رہ گئی ہو۔ اس گھر میں' اس بھرے سنسار میں' بیٹے بیٹیوں' پوتے پوتیوں کے ہوتے ہوئے تنہا.....

اور بے سہارا۔ وہ کہا کرتا تھا۔

"مرنے کے بعد آدمی دیکھ بھی تو نہیں سکتا کہ پیچھے اس کے عزیزوں کا' اس کے گھر کا' اس کے شہر کا کیا حال ہے؟ شاید مرنے والے دیکھنے آتے ہوں؟ کیوں.....؟

لیکن وہ چپ چاپ رہتی تھی۔ وہ کیا جانے.....؟ یہ تو قدرت کا گورکھ دھندا ہے۔ وہ تو بس اتنا جانتی ہے کہ اسے اس کی بہت یاد آتی ہے۔ اسے اپنی زندگی ایک خلا محسوس ہوتی ہے۔ اس بڑھاپے میں وہی اس کا سہارا تھا۔

اس نے کوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ ایک یاس بھری مسکراہٹ۔

"دیکھ لے بڈھے! تمہیں کتنا یاد کرتی ہوں۔"

لیکن اب کہاں ہے وہ بڈھا؟ اف۔ اب تو اس کا صرف یہ کوٹ رہ گیا ہے۔ اس کے استعمال کی تمام چیزیں ختم ہو گئی تھیں' یا ختم کر دی گئی تھیں۔ صرف یہ کوٹ بچا تھا۔ اب یہی اس کی نشانی تھی۔ اس کوٹ کو وہ یونہی اس ٹرنک میں پڑا رہنے دے گی اسے دیکھنے سے اس کے شوہر کی تصویر ابھر آتی ہے۔

اور اس نے کوٹ کو تہہ کر دیا تاکہ پھر سے ٹرنک میں رکھ دے۔ ابھی وہ اسے ٹرنک میں رکھ ہی رہی تھی۔ کہ اس کی بڑی بہو اوپر اس کمرے میں آ گئی۔

"اماں..... ملا کوئی سوئیٹر.....؟"

اور اس نے اپنے سوال کا جواب پانے سے پہلے ہی ایک اور سوال کر دیا۔ "ارے یہ کوٹ تو بابو جی کا ہے؟..... لاؤ تو اس میں سے ننھے کا ایک کوٹ نکل سکتا ہے۔ ابھی تو کپڑا کافی مضبوط ہے۔" اور اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کوٹ لے لیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رہی سہی پونجی بھی کسی نے لے لی ہو۔

"نہیں بہو۔ اس کپڑے میں بنا ہوا کوٹ ننھے کو اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے اپنے شوہر کی اس نشانی کو بچانے کی کوشش کی۔ بہو کو یہ کیسے کہے یہ اس کے شوہر کی آخری نشانی ہے اسے یونہی پڑا رہنے دو۔

اس نے حسرت بھری نظروں سے کوٹ کو دیکھا۔ بہو اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ جانے بہو کو اس کی بات سچ معلوم ہوئی یا اسے کوئی اور خیال آ گیا۔ وہ اسے کوٹ واپس کرتے ہوئے بولی..... "ہاں رہنے دو۔ اس کپڑے سے بنا کوٹ اسے اچھا نہیں لگے گا۔" اور بہو دوسرے ٹرنکوں میں سے کچھ تلاش کر کے چلی گئی۔ اس نے وہ کوٹ تہہ کر کے ٹرنک میں رکھ دیا

اور مطمئن سی نیچے آ گئی۔ اپنے سب سے چھوٹے پوتے کی چارپائی کے پاس سے گزری تو وہ اسے خواب میں ہنستا دکھائی دیا۔ اسی کے لیے وہ سوئٹر تلاش کرنے گئی تھی۔ کسی دوسرے پوتے کا اترا ہوا سوئٹر..... خواب میں اسے ہنستا ہوا دیکھا تو وہ ٹھٹھک گئی۔ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر اسے بڑے اشتیاق سے وہ دیکھنے لگی۔ اور پھر جیسے کسی جذبے سے مسحور ہو گئی ہو۔ اس نے سوئے ہوئے اس بچے کو چوم لیا۔ اتنے زور سے چوما کہ بچہ جاگ گیا اور رونے لگا۔ لیکن وہ پھر بھی اسے چومے جا رہی تھی۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنے پوتے کو گود میں لیے زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھی اپنے شوہر کا وہی گرم کوٹ قینچی سے کاٹ رہی تھی۔ اس کوٹ میں سے کپڑا نکالنے کے لیے اس کپڑے سے اپنے پوتے کا کوٹ بنانے کے لیے..... اس کی بہو حیران تھی کہ ساس نے یک دم اپنی رائے کیوں بدل دی.....؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو کہہ رہی تھی۔ اس کپڑے سے بنا کوٹ ننھے کو سجے گا نہیں..... اور اب.....؟؟..... بہو کی حیرت بھری نگاہیں وہ پہچان گئی..... لیکن وہ اسے کیسے بتاتی کہ اسے ننھے کی شکل میں اپنا مرحوم شوہر نظر آ گیا تھا۔

درد کا ساحل کوئی نہیں

انور عظیم

پت جھڑ کی شام کی طرح اداس موسیقی کمرے میں یوں گھل رہی تھی جس طرح ہونٹوں کے ملاپ میں دلوں کی آگ گھلتی ہے۔ دن ڈھل رہا تھا اور باہر سورج کی پہلی پڑتی ہوئی کرنیں دروازے اور کھڑکیوں کے پردوں پر ا-بسٹریکٹ ڈیزائن پر جھملا رہی تھیں۔ لیکن اندر جھٹپٹے کا سماں تھا کہیں پرچھائیاں کہیں مدھم مدھم جوت۔ چھت کے پنکھے کا عکس بڑی میز کے آئینے میں عجیب سی جھلملاہٹ پیدا کر رہا تھا۔ چھوٹی میز پر کافی کی آدھی پی ہوئی پیالی ٹھنڈی ہو رہی تھی اور "کامو کے آوٹ سائڈر" کے صفحے خود بخود الٹ رہے تھے۔ لگتا تھا یہ کتاب بھی موسیقی کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔ اور اپنی اجنبیت اور تنہائی سے خوف زدہ ہے۔

پھر وہی بور فضا ہو گی وہی تھم تھم کر بہکتے ہوئے قدم' ایڑیوں پر گھومتے ہوئے' پنجوں پر چلتے ہوئے لوگ' بے مہک پھولوں کی تعریف کرتے ہوئے لوگ..... اس پر طرّہ یہ کہ وہ پھر میری طرف حریص آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اور ندیدے پن کی داد طلب کریں گے۔ مجھ سے یہ چھچھورا پن نہ دیکھا جائے گا۔ یہ محتاجی' یہ مظلومی! میرجی کیسا کیسا تو ہو گا' دم گھٹے گا' میں وہ چیز غٹ غٹ محض بوریت میں چڑھا جاؤں گی جو مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ یہ بھی کیا زندگی ہے۔ وہی چیز گلے سے اتارے جاؤں جو بوگس سی بے کار سی چیز ہو..... اور یہ کم بخت جنگل کے جنگل بال ہیں یا وبال۔ یہ میرے جانی دشمن..... اور لو یہ چاندی کے تار بھی چمکنے لگے۔ ایک میری پھوپھی جان کے بال ہیں گر کر ہوا ہو گئے مگر کیا مجال جو کالے مخمل پر ہلکی سی دھوپ جگمگائی ہو اور وہ خبیث کمیش کیسی بے غیرتی سے تکے جاتا ہے۔ سب سے یہ چاندی کے تار چھپ جائیں مگر اس بلی کے بچے کی آنکھیں کیا نہیں دیکھ لیتیں۔ پھر بکرے کی طرح اپنی جوانی کا

ترانہ گائے گا۔ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے گا اور ڈکار لے گا۔ میرا بس چلے تو..... میرا بس چلے تو اپنے سر پر سیدھا استرا پھروا لوں اور اس کی ناک پر الٹا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یہ شام بھی غارت ہوئی۔ کیسے مزے میں پائنتی سے سر ڈھلکائے' تکیے پر ٹانگیں جمائے "آؤٹ سائڈر" پڑھ رہی تھی۔ پیرس کی کسی بو ہمین حسینہ کی طرح' لیکن پیرس کی حسینہ تو کچھ اور بھی کرتی ہے..... کیسے مزے میں الٹی دنیا سیدھی نظر آ رہی تھی۔ اور سیدھی دنیا الٹی لگ رہی تھی۔ ہائے کتنا اچھا لگ رہا تھا' سب اسپائل ہوا۔

سلمٰی جلیس نے اپنا دبلا پتلا صندلیں ہاتھ بڑھایا اور ایک کھڑکی کا پردہ سرکایا شام کی پہلی سنہری روشنی کمرے میں در آئی جس طرح پپوٹوں پر نیند اترتی ہے۔ اس نے سنگار میز کے سامنے ذرا سا خم کھا کر اپنا ہیئر ڈو دیکھا جو تازہ ترین فیشن سے بالکل الگ تھا۔ جس طرح اس کا اپنا من اس سے الگ تھا۔ بالکل آزاد اکیلا' اور اپنے کہنے کا کبھی پہاڑی چشمے کی طرح چنچل اور کبھی برف پوش چٹان کی طرح گمبھیر۔

اس کے حریری ڈریسنگ گاؤن کا بند کھلا ہوا تھا اور اس کا دھان پان جسم لچک رہا تھا۔ کنول کے ڈنٹھل کی طرح لمبی گردن پر بڑا سا تل چمک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بڑی ڈھارس بندھی کہ موذی چاندی کے تار کالے بالوں کے جنگل میں کہیں بھٹک کر رہ گئے اور اب اس بلی کے بچے کی آنکھیں بھی پتہ پا جائیں تو..... اس نے مڑ کر راشنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ٹائم پیس پر نظر ڈالی۔ رسٹ واچ کی طرح اس کی بھی حرکت قلب بند ہو چکی تھی۔ اور اس میں گزرے ہوئے دن کے سات بج رہے تھے۔ یہ گھڑی بھی بکواس' فضول چیز ہے' کیا مجال جو کبھی کوک بنا چل جائے۔

کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ ہر دھڑکن' ہر ہلچل' ہر آہٹ' ہر جھونکا الگ ہے۔ پت جھڑ کی ہواؤں میں اڑتے ہوئے زرد پتوں کی طرح دور دور الگ' ایک دوسرے سے' ہوا سے دامن چھڑاتے ہوئے زرد سوکھے پتے۔

آج پھر لیٹ ہو جاؤں گی۔ نہ جانے کس پیر کی بد دعا ہے کہ ہر چیز میں یا تو دیر ہو جاتی ہے یا جلدی۔ کوئی کام بھی تو وقت پر نہیں ہوتا۔ شروع سے زندگی کا یہی ڈھچر ہے اور اب آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے۔ یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ اب میں خسارے کے ہر احساس سے بلند ہو چکی ہوں اور اس بلندی میں کتنا اچھا لگتا ہے۔ بادل کے چھوٹے سے آوارہ ٹکڑے کی طرح ہواؤں میں تیرنا' نہ گرجنا نہ برسنا۔ آخر اس نے ساری لپیٹی اور پلّو کو بائیں ہاتھ

میں سنبھال کر آئینے میں آخری جھلک دیکھی "ناٹ بیڈ!" پھر ہونٹ پچکائے' الاؤ کی طرح زبان لہرائی' جھلملائی اور اس کے دل پر اوس سی پڑ گئی۔ میں نہ جانے کیوں ہمیشہ غلط رنگ چنتی ہوں۔ مارچ کا مہینہ' ہوا میں خنکی' شام کا وقت' یہ تیکھا ہیر ڈو' نیچرل میک اپ' اور اس پر یہ بورگرے رنگ' گاڈ!..... لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اور اس خبیث کا چہرہ..... حالاں کہ سچ یہ ہے کہ میرے کالج کی کوئی کولیگ کلر سینس میں میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی' مونیکا بھی نہیں جو اکسونین لب و لہجے میں بات کرتی ہے' اور انجلی بھی نہیں جو مسکراہٹ کا استعمال اس خوبی سے کرتی ہے جس حسن و خوبی سے منجھے ہوئے پریس فوٹوگرافر فلیش کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ دن رات کھٹ کھٹ' تھینک یو' تھینک یو! لیکن ان لڑکیوں میں.....

یہ سوچتے سوچتے مس سلمیٰ جلیس کے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔ کہنے کی بات تو نہیں۔ ان کو لڑکیاں کہنا بھی بڑا ظلم ہے۔ بے چاری لڑکیاں تو وہ ہیں جو کلاسوں میں حیران نظروں سے دیکھتی رہ جاتی ہیں کہ مس فلاں' مس فلاں' کیٹس اور شیلے کے سیدھے سادے لفظوں میں دنیا بھر کی پراسرار آوازیں کیسے سن لیتی ہیں۔ "لیکن یہ تو ماننا پڑے گا مس سلمیٰ جلیس' اس نے اپنے آپ سے کہا تم ان کے سامنے پانی بھرتی رہ جاتی ہو اور وہ کہاں نکل جاتی ہیں۔ بھئی بات یہ ہے کہ وہ کچھ تجربہ بھی رکھتی ہیں۔ انہوں نے کچھ دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی ہیں۔ لیکن یہ واقعی اکسپریشن ہے۔ آفٹر آل' عورتوں کے لیے' لڑکیوں کے لیے تو اور بھی۔ مجھے تو فلرٹ کرنا بھی نہیں آتا ڈھنگ سے اور جی چاہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دن میں نے چڑ کر انجلی سے کہہ دیا کہ..... دیکھو میں اب اس حد سے نکل چکی ہوں۔ میرا سیکس مر چکا ہے اور سیکس ہی سب کچھ نہیں ہے۔ ہاں ایک وقت تھا جب جسم نہ جانے کیسی گرمی کو' نہ جانے کیسی خوش بو اور حلاوت کو پکارتا رہتا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ میں مور ہوں اور بن میں اکیلی ناچ رہی ہوں۔ میں پکارتی ہوں اور کوئی میری پکار نہیں سنتا۔ مگر اب میں اس بن سے نکل آئی ہوں۔ ہاں' ہاں صرف یہی نہیں کہ ان کے پاس کچھ "ایسٹ" ہے وہ اس کا استعمال بھی جانتی ہیں۔ کیوں' انجلی اور مونیکا کے ساری باندھنے کا انداز ہی کوئی دیکھے۔ ستار کی طرح راگ راگنیوں سے بھرے ہوئے جسم' آنکھوں کی طرح کھلتے ہوئے بند ہوتے ہوئے جسم اور سچ۔ یہ سب ساری باندھنے کا انداز ہے کہ بجھے ہوئے چراغوں کی بھی روشنیاں ابل پڑیں۔ ہے نا رشک کی بات کبھی کبھی میں کتنی جیلس ہو جاتی ہوں۔ کبھی کبھی کی بھی ایک ہی رہی' اس نے ہوّہ اٹھایا تو کنجی غائب' کنجی ملی تو تالا غائب اور تالا بھی آخر مل گیا تو وہ خود غائب۔ اب کوئی قیامت

تک ڈول ڈالا کرے۔ ایک منٹ کو وہ بیچ کمرے میں کھڑی ہو گئی جہاں سے ڈوبتے سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ باہر نکل رہی تھیں۔ جس طرح سمندر سے مچھیرے کا جال نکلتا ہے ہاں اب کیا کرنا ہے۔ کیا کرنا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ باہر جانا ہے۔

اس نے باہر نکلتے ہی دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ قلابہ ملائے بغیر تالا ڈال دیا اور کھٹ سے کنجی گھما دی۔ پھر جھنجھلائی' قلابہ ملایا' جھنجھلائی اور دوبارہ جھٹکے سے تالا ڈال دیا دانت ملائے بغیر کنجی گھما دی اور زینے سے اترنے لگی۔ اب وہ ہوا کی طرح تھی۔ اب اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہی اس کے چلنے کا انداز تھا۔ جس کو اپنی جان عزیز ہو راستہ سے ہٹ جائے یا پھر جسے توفیق ہو جاں بحق تسلیم ہو جائے۔ ہوتا یہ تھا کہ لوگ راستہ سے ہٹ جاتے تھے۔

اس زندگی میں قدم قدم پر ٹوکروں پرابلم تھے۔ کس وقت کون سا لباس پہنا جائے اس کا پرابلم' کن کپڑوں کے ساتھ کون سی لپ اسٹک پھبیری جائے اس کا پرابلم..... اور کون سا ہار گلے میں ڈالا جائے یہ بھی ایک پرابلم۔ کیوں کہ اس کے پاس ہار ان گنت تھے۔ ہر رنگ کے ہار۔ پھر ان میں ہر ایک کی الگ الگ تاریخ تھی۔ ہر ایک کے ساتھ ایک الگ قسم کی وابستگی۔ ایک تو وہ ہار تھے جو یورپ کے سفر میں خریدے گئے تھے۔ ایک ہار روم کے کھنڈروں کے پاس چھوٹی سی دوکان سے خریدا گیا تھا جہاں فلورنس کی بڑھیا تازہ تازہ' نقلی پتھروں کے ہار یہ کہہ کر بیچتی تھی کہ یہ ہار دراصل قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں' سکندر اعظم کے وقت سے۔ لیکن یہ جھوٹ صرف اس کی زبان پر ہوتا تھا' جھریوں سے گھری ہوئی آنکھوں میں نہیں۔ جو ہنس ہنس کر کہتی تھیں "تم جانتی ہو رانی زمانۂ قدیم کے اتنے سارے ایک ہی جیسے ہار کہاں مل سکتے ہیں؟" لیکن سلمٰی جلیس نے ایک ہار وہاں خریدا' ایک وینس میں' ایک پیرس میں' لندن میں اس سے ایک سیکنڈ ہینڈ ریکارڈ پلیئر کے سوا اور کچھ نہ خریدا گیا۔ وہ بھی کیمرج کے دو سالہ قیام کے دوران چھٹیوں میں اٹلی' فرانس اور سوئٹزر لینڈ کی سیر کو نکلی تو وہ ایک سیکنڈ ہینڈ دوکان کی نذر ہو گیا جس کا غم آج بھی اس کی چھاتی پر سل کی طرح دھرا ہوا تھا۔

لیکن اس کی تلافی اس وقت ہو جاتی تھی جب اسے یاد آتا تھا کہ اٹلی میں تو ہر جگہ وہ انتہائی سستے قسم کے پیونے میں ٹھہری تھی۔ تربوز کی سرخ سرخ پھانکیں کھا کر دن کاٹے تھے اور رافیل لیو نارڈو' مائیکل اینجلو' رمبراں' مودلیانی کے شاہ کاروں کے ری پروڈکشن خریدے تھے جن میں دنیا کے حسین ترین رنگ تھے' جن میں دلوں کو تھرتھرانے والے' پگھلانے والے خطوط' دھوپ چھاؤں' غم اور نشاط کی پھواریں اور نہ جانے کیا کیا دولتیں جاگ رہی تھیں۔ اب اس کے

سامنے پرابلم یہ بھی تھا کہ ان حسن پاروں کو سات سمندر پار سے لانے میں اس نے جس قربانی اور تیاگ سے کام لیا تھا لوگ اس کا قصہ سنیں' دانت سے انگلی کاٹیں' کبھی کبھی یہ ذکر سن کر بے ہوش ہو جائیں اور جب ہوش آئے تو ہاتھ ملیں اور آنکھیں پھاڑ کر کہیں "بھئی تم جینئس ہو!" اور اس بات پر دل میں ہنستی تھی کیوں کہ ایک ہار گلیڑنگ پارٹی میں ایک خاتون جن کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بڈھی گھوڑی لال لگام کا خیال آتا تھا۔ مکتی ہوئی اور ہونٹوں سے خون لہو ٹپکاتی ہوئی اور اپنی موٹی موٹی اداؤں سے کشتے کے پشتے لگاتی ہوئی ریلتی پیلتی اس کے پاس آئیں اور بولیں "اف یو ڈونٹ مائنڈ..... ذرا میں آپ کا ہار دیکھ سکتی ہوں؟" اور ہار کو چھو کر اور مس سلمٰی جلیس کی نازک گردن کو کوچوان کی طرح جھٹکے دے کر گویا ہوئیں "بھئی اب تو مجھے بھی پیرس جانا پڑے گا۔ کیا جان لیوا ہار ہے" مس سلمٰی جلیس نے یہ ہار پیرس میں نہیں بلکہ نئی دلی میں امپریل ہوٹل کے پاس درختوں کے نیچے ایک تبتی عورت سے خریدا تھا جس کی کلائیوں میں موٹے موٹے کنگن بج رہے تھے اور جو ننگی زمین پر بیٹھی اس بے تکلفی سے چنے پھانک رہی تھی کہ بڑے بڑے صوفہ نشین بھی اس شان سے بیٹھ کر کیک پیسٹری نہیں اڑاتے ہوں گے۔ اب یہ بھی ایک پرابلم تھا کہ کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ کوڑے کباڑ کے ڈھیر سے موتی چننے کے لیے بھی نظر کی ضرورت ہے۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے.....

یہ لطیف بات ان غبی' موٹی چربی والی کی کھوپڑی میں بھلا خاک آنے لگی۔ سڑک پر آ کر وہ سوچ میں پڑ گئی ٹیکسی بلائی جائی یا اسکوٹر رکشا سے کام چل جائے گا "یا" کی زندگی میں وہی اہمیت تھی جو مچھیروں کی زندگی میں جال کی ہے۔ اگر کسی نے پوچھا کھانا کھاؤ گی سلمٰی؟ تو جواب ملتا۔ کھانا کھالوں گی یا پانی پی لوں گی یا شاید نہیں پیوں گی یا..... روزانہ رات کو جب گھنٹوں نیند نہ آتی اور دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتے کرتے تھک جاتی تو یکایک اس کے ذہن میں یہ خیال کوند جاتا کہ میں بڑی فضول خرچ ہوں' مجھے ٹیکسی بازی نہیں کرنی چاہیے۔ جتنے پیسے میں ٹیکسی میں اڑا دیتی ہوں' اتنے میں تو ہزاروں لوگ اس شہر میں پورا مہینہ گزر بسر کر سکتے ہیں۔ اچھا کل سے ٹیکسی بند۔" لیکن اس وقت بھی جب سڑک پر اس کے بال ہوا میں اڑنے لگے اور تیزی سے ڈھلتی ہوئی شام کا احساس تیز ہوا تو اس نے ٹیکسی میں ہی چھوٹا سا سفر طے کرنے کا فیصلہ کیا جو وہ بس میں پانچ پیسے میں طے کر سکتی تھی "خدا کی پناہ بس میں پٹرول اور جانے کیسے کیسے انسانوں کی بو بسی ہوئی ہوتی ہے..... بوجیسے بھیڑوں میں ہوتی ہے۔" پاس سے گزرتے ہوئے یونی ورسٹی کے ٹیڈی چھوکروں نے چست پتلونوں میں دس دس بل کھاتے ہوئے سیٹیاں بجائیں اور کوئی چلتا

ہوا فقرہ چھوڑا تو اس نے دوڑتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔.....

سردار جی نے ٹیکسی کی رفتار تیز کی تو اس نے سوچا' شوہر اور کچھ نہیں تو ایسے رکیک لمحوں میں اچھا باڈی گارڈ ثابت ہوتا ہے۔ رات گئے تک تھیٹر کے مزے اڑاؤ۔ ہوٹلوں میں گھومو' ڈنر کھاؤ' کوئی کھٹکا نہیں..... میرے خیال میں زیادہ عورتیں شادی کے بعد' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی دیکھنے کے بعد بھی اگر اپنے کم ظرف اور کمینے میاؤں سے چپکی رہتی ہیں تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ انہیں ایک ہٹے کٹے قابل اعتماد باڈی گارڈ کی ضرورت ہوتی ہے..... نہ جانے وہاں کون کون ہو گا..... ایک سے ایک اسنوب.....؟

وہ جس حلقے میں گھومتی تھی' اٹھتی تھی بیٹھتی تھی' وہاں اس کو زیادہ تر لوگ اسنوب نظر آتے تھے بلکہ اب تو صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ وہ اپنے سوا سب کو اسنوب سمجھتی تھی۔ کبھی کبھی تنہائی میں جب وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی تو اپنے کان میں چپکے سے کہتی..... بات یہ ہے کہ میں خود اسنوب ہوں..... یہ ایک مرض ہے جو کمتری کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔

کمیش کی اینٹ کا جواب وہ پتھر سے دے گی تو وہ بلبلا اٹھے گا۔ اپنی ٹائی کی گرہ کو اور کس لے گا اور کہے گا تم بہت نک چڑھی ہو۔ میں نک چڑھی ہوں تمہاری بلا سے۔ مسز سکسینہ نے خواہ مخواہ مذاق ہی مذاق میں یہ بات اس کے دل میں ڈال دی ہے کہ میں اس پر فریفتہ ہوں۔ وہ بھی اس قسم کے مردوں پر جن سے سیدھے منہ بات کر لو تو عاشق سے معشوق میں تبدیل ہو جاتے ہیں جیسے سرف پاؤڈر پانی میں چکر کھاتے ہی جھاگ میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن اسنوب اصل میں وہ مسٹر سیٹھی ہیں جو اپنے آپ کو مردانہ حسن میں قدرت کا شاہکار سمجھتے ہیں اور اپنی غزل سنانے سے پہلے دل پر ہاتھ رکھ کر دو تین بار ضرور چھینکتے ہیں۔ ناکیں بھی دنیا میں قسم قسم کی ہوتی ہیں: غضب ناک' ہیبت ناک' حسرت ناک' حیرت ناک وغیرہ وغیرہ..... مگر مسٹر سیٹھی کی ناک کون سی ناک ہے' اس کا آج تک سراغ نہیں ملا۔ خیر جو بھی ہو قدرت کا شاہکار ہے۔ کیا بڑھیا ناک سے انگریزی بولتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کو ناک صرف انگریزی بولنے کے لیے ملی ہے۔ جب ہی تو لوگ میرا مطلب ہے لڑکیاں ان سے اتنا مرعوب ہیں۔ دس ایسی کتابوں کے نام لے لیں گے جن کے مصنف آج تک پیدا ہی نہیں ہوئے اور پھر بڑی سادگی سے پوچھیں گے۔ ذرا سا جھک کر اور اپنی ناک کو کھجا کر' میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ کر..... "آپ نے تو پڑھی ہوں گی؟" اور لوگ میرا مطلب ہے لڑکیاں سر جھکا کر چھوئی موئی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن جب میں حملہ کرتی ہوں تو جناب کو دن میں تارے نظر آجاتے ہیں۔ موسم کا ذکر چھڑ جائے یا

کتے کے خوب صورت کانوں کا یا کسی فلم ایکٹریس کی خود کشی کا یا کسی امریکی انٹر پرازنگ چھوکری کے کسی راجہ مہاراجہ سے بیاہ رچا لینے کا۔ اور مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ مسٹر کتنے پانی میں ہیں کیوں کہ سارا ماڈرن انگریزی ادب میرے لیے پانی ہے۔ چاہے سارتر ہو' ٹھیک ہے ٹھیک ہے وہ فرانسیسی ہے تو کیا ہوا' یا آرتھر ملر کلا سکس ہو یا..... سب پانی ہے۔ مس سلمٰی جلیس کو اپنی آواز بہت زیادہ پسند تھی بلکہ اسے اپنی آواز سے عشق تھا۔ وہ نغمہ کی دولت سے محروم تھی لیکن آواز سے لبالب بھری ہوئی اور جب چھلکتی تھی تو گھنٹوں چھلکتی جاتی تھی۔ لیکن ذرا سی پر تکلف محفل ہوئی اور اس کی سٹی گم۔ وہ اپنی آواز میں لچھے دار انگریزی کا کمال اس وقت دکھاتی تھی جب مونیکا یا انجلی یا کوئی کولیگ یا چھوٹی بہن نرغے میں آ جاتی تھی۔

جو مس سلمٰی جلیس کے خیال میں ایک اوسط ذہن کی لڑکی تھی اور گھر بسا کر اور بچے پیدا کر کے انتہائی ٹھس قسم کے شوہر کے ساتھ ایک بے معنی اور فضول سی زندگی گزار رہی تھی کیوں کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ اس کی بہن کافی وقت ترکاری اور پھل خریدنے پر' دھوبی کا حساب لکھنے پر' روزانہ کھانے کا مینو بنانے پر صرف کر رہی تھی (کیوں کہ وہ ان چیزوں کی داد صرف کھانے کی میز پر دے سکتی تھی اور وہ بھی کھوئے کھوئے انداز میں بچی کا فراک سل رہا ہے اور بیٹے کی پروگریس رپورٹ پڑھی جا رہی ہے۔ روزانہ اخبار پڑھ لیا اور مہینوں میں گراہم گرین کا کوئی ناول زہر مار کر لیا اور بس چھٹی..... یہ کوئی زندگی ہے! عورت کی آزادی کا پرچم اس کے دل میں ہر لحہ پھڑ پھڑاتا رہتا۔ اسے سیدھے سادے رومان کا تجربہ تھا نہ ٹیڑھے میڑھے عشق کا' لیکن اندھا دھند "دلبڑی" کے حق میں لیکچر دیا کرتی تھی اور برٹینڈ رسل کوٹ کرتی جاتی تھی۔ سیکس پر اس نے کتابیں بہت پڑھی تھیں یا پھر دوسروں کے تجربے سنے تھے۔ لیکن وہ بڑے وثوق سے کہتی تھی "عورت میں سیکس کا تلاطم پینتیس یا چالیس کی عمر میں اپنے پورے شباب پر ہوتا ہے اور مردوں میں اٹھارہ بیس سال کی عمر میں....." اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی اس کی نظر اپنے کند ذہن بہنوئی کی نظر سے لڑ گئی اور اس نے احتجاج کیا تھا۔

Must you listen کیوں کہ وہ کتنی بار اعلان کر چکی ہے کہ اس معاملہ میں تو برف کی سل ہوں۔ خاطر جمع رکھیے جناب!"

سردار جی نے ذرا زور سے کار جو موڑی تو سلمٰی جلیس کے بیٹھنے کا پورا پوز خراب ہو گیا پرس کلائی سے اچھل کر بازو پر پہنچ گیا اور ساری کا "فال" تباہ ہو گیا..... "سردار جی ذرا

آہستہ۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ سردار جی نے ٹیکسی اور تیز کر دی۔

"بادشاہ ہو' کانچ کی گڑیوں کو خاطر میں لانے لگا تو بس کر چکا دھندا۔"

سردار جی کی یہ ادا مس سلمٰی کا موڈ خراب کرنے کے لیے کافی تھی۔ ہر شام کوئی نہ کوئی اس کے موڈ پر بم کی طرح گرتا تھا۔ مس سلمی جو بچپن میں صرف سلو کہلاتی تھی' ہمیشہ سے ضدی تھی۔ اس کا مزاج ستلی کی چارپائی کی طرح تھا جو رات بھر آنگن میں پڑی بھیگتی رہی ہو اور صبح کو دھوپ کھا کر اکڑ گئی ہو۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کے سر سے اس کے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے دیکھا تھا کہ کس طرح انسان کو سفید کپڑوں میں لپیٹ کر آنکھوں سے اوجھل کر دیا جاتا ہے اور پھر نہ اس کا چہرہ دکھائی دیتا ہے نہ مسکراہٹ' نہ آنکھیں اور نہ اس کی آواز سنائی دیتی ہے' نہ قہقہہ نہ آہٹ' پھر سب کچھ کتنا اجاڑ اور ویران لگنے لگتا ہے۔ وہ اکیلی روتی رہ گئی اور جب اس کے آنسو خشک ہو گئے تو وہ اندر ہی اندر سکڑ کر ٹھٹھر کر رہ گئی۔ بہنیں تھیں ماں تھی مگر وہ اکیلی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھی کسی وقت جوہی سفید کپڑوں میں کھو سکتا ہے۔ رحم دل شفیق رشتہ داروں اور عزیزوں نے سر پر ہاتھ رکھا اور آج بھی جب ان کے ہاتھ کا لمس یاد آ جاتا ہے تو اس کے جسم میں ٹھنڈی جھرجھری دوڑ جاتی ہے۔ بڑا سا آنگن ہے جس میں نواڑ کے بڑے بڑے پلنگ بچھے ہوئے ہیں جہاں بیلے اور جوہی کی کیاریاں ہیں۔ شریفے کا درخت ہے۔ رات کی رانی مہک رہی ہے۔ اور تپائی پر صراحی رکھی ہے جس کی گردن میں گجرا پڑا ہوا ہے۔ اور ایک طرف جدھر باورچی خانہ ہے' جہاں کونے میں بکری بندھتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چارپائیاں بچھی ہیں جن میں ایک پر سلو سوتی بنی پڑی ہے۔ اس نے ململ کے میلے کرتے کی آستین سے آنکھیں چھپا لی ہیں اور درختوں کے اوپر تیرتے ہوئے چاند کی کرنوں کے ساتھ اس کی نیند کی ماتی آنکھیں نیچے کو اتر رہی ہیں جہاں اس کے رشتے کی ننھی منی بہنیں سفید چادروں پر سو رہی ہیں اور مامائیں ان کے اوپر مچھر دانیاں لگا رہی ہیں۔ اور مچھر ہیں کہ اڑ اڑ کر ادھر آ رہے ہیں جہاں سلو اور اس کی بہنیں سو رہی ہیں اور ماں بیٹھی پان بنا رہی ہے۔ کچھ سوچ رہی ہے' بڑبڑا رہی ہے۔ ماں بھی چاند میں بیٹھی بڑھیا کی طرح نظر آ رہی ہے جو ازل سے چرخہ کات رہی ہے اسے ایک بات ابھی تک یاد ہے۔ وہ دس گیارہ سال کی ہو گی۔ برسات کی شام تھی باغ میں آم کے درختوں میں جھولا ڈالا گیا تھا۔ رشتے کی بہنیں جھولا جھول رہی تھیں۔ اور باری باری سے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگوا رہی تھیں آخر میں اس کے لیے مہندی نہیں بچی تھی کسی کی چھڑائی ہوئی مہندی اس کی ہتھیلیوں پر رکھنے کی کوشش کی گئی تو وہ بھاگ کھڑی

ہوئی اور آم کے درخت کے نیچے چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ "کیا میں مہندی بنا جی نہیں سکتی۔" بچیاں جھولا جھولتی رہیں' ہنستی رہیں' ان کی ہتھیلیوں سے مہندی چھوٹتی رہی۔ ہتھیلیوں کے چراغ جلتے رہے۔ اوڑھنیاں اڑتی رہیں لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ رات گئے تک آم کے درخت کے نیچے اکیلی کھڑی رہی اسے بالکل یاد نہ تھا آخر اسے کون وہاں سے لے گیا تھا۔ ہاں اسے اتنا یاد تھا کہ وہ رات بھر چارپائی پر پڑی روتی رہی اور صبح کے وقت جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔

اب اس واقعہ کو برسوں بیت گئے تھے وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی لیکن اسے اکثر یہی محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کی ہتھیلیوں پر چھڑائی ہوئی مہندی لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ ہاتھ جھٹک کر الگ ہو گئی تھی۔ اس لیے یونی ورسٹی کے زمانے میں کئی نوجوان صرف اس لیے ریجیکٹ ہو گئے تھے کہ وہ پہلے کسی اور سے پروپوز کر کے ریجیکٹ ہو چکے تھے۔ اگر کوئی ایسا مل جاتا اسے جو بالکل کورا گھڑا ہو' تو آج اس کی زندگی کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔ وہ اپنی ہتھیلیوں پر سچا چوکھا رنگ چاہتی تھی۔ ویسے وہ کہتی کچھ اور تھی "اونہہ شادی میں کیا رکھا ہے۔ شادی تو سبھی کرتے ہیں یہ ان کے لیے ضروری بھی ہے جن کے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔"

اس کا خیال تھا کہ وہ سب کچھ دیکھ چکی ہے۔ بہت کچھ کھو چکی ہے۔ پانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ زندگی میں تلاش کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ تلاش بھی کیا۔ بس ایک انمٹ پیاس! تلاش جس کے سوتے کتابوں سے پھوٹتے ہیں اور صوفے پر بیٹھ کر یا فرش پر لیٹ کر یا مسہری سے سر ٹکا کر بڑے مزے میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ اس کا غصہ ناک پر دھرا رہتا تھا۔ لاوا پھوٹتا تو وہ خود سب سے پہلے اس کی زد میں آتی۔ ہر حالت میں تان ٹوٹتی سسکیوں اور آنسوؤں پر' کبھی تنہا اندھیرے کمرے میں' کبھی پی کر کسی سہیلی کے بازوؤں میں' کبھی بہن کے پہلو میں "دیکھتی نہیں میں کتنی اکیلی ہوں۔ میں اپنے آپ سے بھی کٹ کر الگ ہو گئی ہوں میں دوسروں کے لیے جیتی ہوں۔ میرے لیے کوئی جیتا ہے بتاؤ.....؟" ایسے لمحے میں وہ بالکل بچے کی طرح روتی تھی اور اس کی بہن سوچتی رہ جاتی کہ یہ دوسروں کے لیے جیتی ہے یا صرف اپنے لیے۔ مایوسی کے آئینے میں ہر چیز الٹی دکھائی دیتی ہے۔

انجلی ایسے موقعوں پر بڑی شرارت سے دیکھتی تھی۔ اور سوچتی تھی "کتنی فرسٹیٹڈ ہے یہ لڑکی!" مونیکا جس کی آنکھوں میں سارے جہاں کا درد جھانکتا تھا صرف یہ سوچ کر چپ ہو جاتی تھی۔ "Poor old maid" اور اس کے شانے تھپتھپانے لگتی تھی۔ لیکن یہ سبھی جانتے تھے کہ مس

سلمٰی جلیس یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ فرسٹیشن کا شکار ہیں۔

"جی نہیں معاف کیجیے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں' اپنی خیر منایئے علاج کرایئے نہ جانے آپ کے منہ سے رال کیوں ٹپکتی رہتی ہے۔"

تیز تیز دل شکن بات کہنے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا سب سے زیادہ شامت اس کی آتی تھی جو بدقسمتی سے اس پر عاشق ہونے کی کوشش کرتا تھا..... دیکھو مس سلمٰی جلیس سے عشق کرنے جا رہے ہو تو بیٹا سر سے کفن باندھ کر جاؤ..... یہ نیک مشورہ ہر شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کو دیا کرتا تھا۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ مس سلمٰی کو ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ وہ کانچ کے چست خول میں بند ہے جو کسی کو دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر کوئی پتھر برس گیا تو.....!

ٹیکسی سے اتر کر جب وہ برآمدے میں پہنچی تو مسٹر سکسینہ خود ہی نکل کر آ گئے۔ چھت پر چند کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بیچ میں ایک گول میز تھی۔ فضا سے صاف ظاہر تھا کہ یہ کوئی بڑا شو نہیں۔ ہاں البتہ کمیش بہت زیادہ موجود تھا۔ کمیش کا قد چھوٹا تھا اس کی یہی بات سب سے نمایاں تھی یہ چیز اور بھی اس لیے نمایاں ہو گئی تھی کہ اس کا سر بہت بڑا تھا اور بال گھنے..... اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ پھدک کر مسز سکسینہ کے پاس چلا گیا جو اپنے گنجے' شریف' اور گول مٹول شوہر سے کہہ رہی تھی" دیکھا میں نہ کہتی تھی ضرور آئیں گی۔" یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے گھر میں مس سلمٰی جلیس اور کمیش کے علاوہ اور کوئی مہمان نہ تھا۔ یہ بات مس سلمٰی جلیس کو بہت کھل رہی تھی۔

"آخر یہ کیا بے تکا پن ہے؟"

ایک تو سردار جی نے ٹیکسی میں جھٹکے دے دے کر اس کا موڈ خراب کیا تھا اور اب یہ کمیش..... یہ مکڑا! اس کا خون جمنے لگا۔ جسم اکڑنے لگا۔ آخر یہ قصہ کیا ہے کہ اس بور کو..... بور نوازی کو بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ویسے بڑا سہما ہوا لگ رہا ہے۔ قصہ کیا ہے؟ وہ بے قراری میں اپنے ناخن کریدنے لگی۔ مسٹر سکسینہ نے بڑی نرمی اور محبت سے کمیش کو لے جا کر مس سلمٰی جلیس کے پاس بٹھایا۔ مسز سکسینہ چائے بنانے لگیں۔

"بھئی کتنی شکر؟"

"آپ بنا رہی ہیں تو شکر کی کیا ضرورت ہے؟" کمیش نے اپنا پٹا ہوا جملہ ہزارویں بار دہرایا۔

مسٹر سکسینہ نے مس سلمٰی جلیس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے اور پوچھا "آپ نے ستیش گجرال کی نمائش دیکھی؟"

"میں نے تو پہلے ہی دن دیکھی۔" کمیش ٹپک پڑا "رنگ بڑا اوریجنل ہے۔"

"لیکن وہی پچھلا سٹائل ہے..... وہ جیل اور لاسٹ سپر....."

"اسٹیٹس مین نے بھی کچھ یہی لکھا ہے" مس سلمٰی نے آہستہ سے کہا۔

کمیش بوکھلا گیا۔ اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر مس سلمٰی کے دل کی کھل گئی۔ کمیش پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"وہاں مہاراجہ کشمیر بھی تھے اور وہ کوکا کولا پی رہے تھے۔"

مس سلمٰی جلیس کو ہنسی آگئی۔ کمیش چپ ہو گیا۔

نیچے سے مسٹر سکسینہ کے پتا جی کے کھانسنے اور تھوکنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اس لڑکی سے بہت خفا تھے۔ جس میں بھارتیہ کلچر کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اس کو سگریٹ پیتے دیکھ چکے تھے۔

یہی نہیں ایک بار ان کی موجودگی میں کوکا کولا کلچر' ٹیڈی اور نائلون کلچر پر بحث ہو رہی تھی تو مسٹر سکسینہ کے پتا جی بھی اس بحث میں کود پڑے تھے۔ اور آخر میں بولے تھے۔ "یہ کیوں بھولتے ہو کہ ہم کن سادھوؤں سنتوں کی سنتان ہیں بھگوان نے ہمیں کیا بنایا ہے....." "جی ہاں بھگوان نے ہمیں الو بنایا ہے۔!" مس سلمٰی نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

اب یہ تھا کہ ادھر اس ملیچھ لڑکی نے گھر میں قدم رکھا' ادھر ان پر کھانسی کا دورہ پڑا۔

مسٹر سکسینہ کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور ان کا گول چہرہ چمک رہا تھا انہوں نے مسز سکسینہ کو بلایا "ذرا سننا بے بی رو رہی ہے".....

مسز سکسینہ نے ایک خاص نظر سے (اور کون نہیں جانتا کہ یہ خاص کیا ہوتی ہے) دونوں کو دیکھا اور مسکراتی ہوئی کرسیوں سے کترا کر نیچے چلی گئی۔

"بھئی تم لوگ گپ کرو۔"

دونوں چپ ہو گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے' آسمان پر چاند بھی نہ تھا کہ اس کو دیکھتے۔ ستارے اتنے جھنڈ کے جھنڈ تھے کہ ان کو گنا نہیں جا سکتا تھا۔ اور جب کوئی بے وقوف پاس بیٹھا جوتے کھٹکھٹا رہا ہو تو ایسے میں اختر شماری بھی نہیں ہو سکتی۔ تنہائی چاہیے' خاموشی چاہیے۔

"مس سلمٰی کتنی بھری پری زندگی ہے مسٹر سکسینہ اور مسز سکسینہ کی۔"

"ہوں" مس سلمٰی کا خون کھولنا اور جسم لکڑی ہونا شروع ہو گیا تھا پہلے بھی ایک بار اس کو کمیش کے ساتھ تھیٹر میں اسی طرح چپ چاپ بٹھا دیا گیا تھا۔ خیال یہ تھا دوستی ہو جائے گی ایسی دوستی جو شاید بعد میں رنگ لائے۔ لیکن یہ ٹھگنا سا گورا چٹا نروس سا آدمی نائلون کی شرٹ میں ناکتخدا لڑکی کی طرح بدن چرائے بیٹھا رہا۔ کیا مجال جو اس کا منہ کھلا ہو اور وہ انتظار کرتی رہی۔ جب اندھیرا ہوا اور نہایت ہی مڈیوکر قسم کا ڈرامہ چل پڑا تو مس سلمٰی نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ لیکن وہ اپنا بجھا ہوا پائپ چوسنے لگا اور ایسا سن ہو گیا جیسے ڈرامے میں کھو کر رہ گیا ہو۔ اور اب جو بولا تو اسے وہی رات یاد آ گئی۔

"کسی دن کسی پکنک کا پروگرام بنائیں۔" کمیش نے دوبارہ قطب مینار پر چڑھنے کی کوشش کی۔

"پکنک" اس کی آواز میں عجب طرح کی بیزاری بھری ہوئی تھی۔

"میرا مطلب ہے کیوں نہ کوئی فلم دیکھیں چل کر آج کی رات؟"

"آج کی رات؟"

"میں مس انجلی سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ تو کہیں پاس ہی رہتی ہیں نا؟"

"کیا.....؟"

کمیش کی آواز رندھ گئی اور وہ بے تحاشہ مسز سکسینہ کو پکارنے لگا۔ جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا تو وہ دبی زبان سے بولا۔

"مسز سکسینہ کے بچے کتنے پیارے اور بھولے ہیں۔"

"بچے تو ہمیشہ بھولے اور پیارے ہوتے ہیں۔" مس سلمٰی کی آواز بھی رندھی جا رہی تھی۔ آخر یہ شخص، یہ گدھا، یہ good for nothing جو برما شیل میں کام کرتا ہے۔ اور جس کے کپڑوں اور باتوں سے پٹرول کی بو آتی ہے۔ چاہتا کیا ہے۔

کیا میں کھڑی کھڑی اس سے یہیں شادی رچا لوں اور صبح ہوتے ہوتے مسز سکسینہ کی طرح ایک چوتھائی فٹ بال ٹیم کی ماں بن جاؤں۔

مس سلمٰی جلیس کے ہونٹ جلنے لگے اور دم گھٹنے لگا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کمیش سے پوچھا جو اب تک اسی تندی سے بغیر کسی تال کے جوتے کھٹکھٹا رہا تھا۔

"کمیش صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قسم کی چائے ہے جس میں میزبان اپنے دو آنریبل مہمانوں کو چھوڑ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے ہیں۔"

"بھئی گدھے کے سینگ، بھئی خوب، مس سلمٰی آپ غضب کرتی ہیں..... ہاں واقعی یہ لوگ کیوں نہیں آتے؟ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

"اچھا آپ بس یہی سوچ رہے ہیں۔"

کمیش خوب جانتا تھا کہ چائے کی دعوت کیوں دی گئی ہے اس کا حافظہ اتنا کمزور نہ تھا ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے کہ اس نے مسٹر سکسینہ کو فون کیا تھا۔

"بھئی مس سلمٰی ایک عرصے سے دکھائی نہیں دی کیا ان کی شادی کرا دی؟" مسٹر سکسینہ کے دل کی دھڑکن مس سلمٰی کا نام سن کر ہمیشہ تیز ہو جاتی تھی۔ یہ بات کمیش بھی خوب جانتا تھا۔ مسٹر سکسینہ کی تقریباً گھگھی بندھ گئی تھی۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟"

"بس کچھ نہیں ملنے کا بہانہ چاہتا ہوں۔"

"مگر آخر کیوں؟" مسٹر سکسینہ مزے میں آ گئے۔

"وہ بات یہ ہے کہ کئی راتوں سے نیند نہیں آئی ہے۔"

"اچھا تو تمہیں سلیپنگ پلز چاہیے.....!"

"اور نہیں تو کیا؟" اس کے دل نے بلیوں اچھل کر کہا۔ "حرا مزادہ!"

مسٹر سکسینہ نے جب رسیور رکھا تو اس کے گنجے سر پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

اور اب مس سلمٰی جلیس اپنے فارم میں آ چکی تھی۔ اس کا جسم اکڑ چکا تھا اور اس کی ناک سانس کی گرمی سے جل رہی تھی کیوں کہ اسے سب سے زیادہ افسوس یہ تھا کہ اس نے شام کے لیے نہ جانے کتنا وقت میک اپ پر صرف کر دیا اور یہاں آ کر نکلا کمیش، کم بخت!

"بات یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی بڑے ڈسکریٹ ہیں انہوں نے ہمیں باتیں کرنے کا موقع دیا ہے۔ وہ کھڑی پتلیوں کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ آیئے کھیلیں۔"

کمیش کی ٹانگیں سن ہو رہی تھیں اور خیریت یہی تھی کہ وہاں روشنی نہیں تھی ورنہ اس کا چہرہ ڈوبتے ہوئے انسان کا سارا راز فاش کر دیتا۔

"کھیلیں..... کیا کھیلیں مس سلمٰی؟"

"مسٹر کمیش وہی، اقرار و انکار کا کھیل..... آیئے ہم ہی ڈرامہ کھیلیں اور ہم ہی تماشہ دیکھیں۔" "How unfortunate" کمیش نے بچے کی طرح تتلا کر کہا۔

مصلحت کے مطابق کافی بڑا وقفہ دے کر جب مسٹر اور مسز سکسینہ اوپر چھت پر آئے تو

ساتھ ہی بے بی بھی آ گئی جو خلاف معمول بہت اچھے موڈ میں تھی۔ آتے ہی اس نے مس سلمٰی جلیس کے بال نوچے جس نے بے بی کا نوٹس بس اتنا لیا کہ ایک چمچہ شکر سے بھرا ہوا اس کے منہ میں ڈال دیا۔ کمیش کے بال بھی نچے اور ٹائی بھی لیکن وہ جوتے کھٹکھٹاتا رہا۔ میزبانوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فضاء میں کافی تناؤ ہے۔ مسٹر سکسینہ بہت خوش ہوئے کیوں کہ ان کے دل کی دھڑکن مس سلمٰی جلیس کا نام سنتے ہی تیز ہو جاتی تھی۔ مسز سکسینہ نے اس لیے فاتحانہ شان سے کمیش کی طرف دیکھا کہ ایک طرف تو وہ سلمٰی کو "اسپنسٹر" سمجھتی تھیں اور دوسری طرف ان کی زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی آتے تھے۔ جن کی اداسیوں کے بے معنی لمحوں کو کمیش اپنے اندر جذب کر لیتا تھا جیسے اسفنج میں پانی جذب ہوتا ہے۔ اور یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ایک بار مس سلمٰی نے اپنے دوستوں' انجلی اور مونیکا سے کہا تھا "وہ....." تم بھی غضب کرتی ہو..... میں affair بھی کروں گی تو اس اسفنج سے!"

ایک بے تکی خاموشی چھائی رہی۔ پیالیوں میں چمچے گھومتے رہے۔ بے بی چار بڑوں کا دل موہنے کے جتن کرتی رہی۔ اور ان چاروں کو دیکھ کر بے آواز تالیاں بجاتی رہی۔

"میں کوئی ایسی ویسی نہیں ہوں۔" مس سلمٰی کی روح چیخ رہی تھی "اگر میں یورپ میں ہوتی' تو لندن یا پیرس میں تو آج....."

مسٹر سکسینہ دھندلکے میں اس کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ جانتے تھے یہ لڑکی' یہ بے قرار افسردہ لڑکی اپنے ہونٹ کاٹ رہی ہے۔ اور شاید کوئی بھیانک بات سوچ رہی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اس کی اس بات میں بھی حسن ہو گا' حسن! اور اس وقت جو ایسے میں ہمیشہ ہوتا ہے' مس سلمٰی جلیس بیٹھی رہی اور حیران آنکھوں سے اپنے آپ کو دیکھتی رہی اب وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ مسٹر اور مسز سکسینہ' نہ کمیش' وہ ایک ایسی چھت کے کنارے کھڑے تھی جس کے نیچے کوئی ستون نہیں تھا۔ چھت سمندر کی لہروں میں بہہ رہی تھی۔ اس سمندر کا کوئی ساحل نہ تھا۔ اوپر آسمان بھی نہ تھا۔ چاند بھی نہ تھا۔ ستارے بھی نہ تھے۔ وہ تھی اور چھت تھی جو ایک کالے سمندر کی موجوں پر بہہ رہی تھی اور وہ چھت کے کنارے کھڑی تھی۔

اس کا دل بھر آیا۔ اس نے پرس سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں کہاں۔" میزبانوں نے پوچھا۔

کمیش نے سوچا لپک کر لفٹ پیش کرے "مارو گولی۔ بلا ٹلی۔" وہ چپکا بیٹھا رہا اور ایک پرچھائیں کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ پرچھائیں نہ

جانے کتنی بار اس کی لفٹ کی پیش کش کو ٹھکرا چلی ہے۔ A mad cap go to hell وہ دانتوں سے ناخن کتر رہا تھا۔

"تم سلمٰی کو اپنی کار میں لفٹ تو دے دیتے۔" مسز سکسینہ نے احتجاج کیا "چلو تم بھی بڑے ویسے ہو ذرا شیولری نہیں....."

"میں دوں گا لفٹ مس سلمٰی کو؟ بڑی بددماغ اور واہیات عورت ہے۔"

"عورت" مسٹر سکسینہ نے چونک کر پوچھا۔

کمیش اٹھا اور کوٹ کے کالر پر ہاتھ پھیرتا اور سیٹی بجاتا ہوا زینے پر بھاگا اور اس نے دیکھا وہی پرچھائیں خاموشی سے لیمپ پوسٹ کے پاس کھڑی ٹیکسی کا انتظار کر رہی ہے جیسے کوئی عورت بارش میں بھیگ رہی ہو۔ اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور اس کے پاس پہنچ کر روک لی۔ دروازہ کھولا اور بڑی محبت سے بھکاری کی طرح بولا "آیئے مس سلمٰی میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

مس سلمٰی بہت آہستہ آہستہ مڑی اور چپکے سے کار میں بیٹھ گئی اسے کار بڑی خوبصورت اور آغوش کی طرح گرم معلوم ہوئی۔

کار مال روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ کمیش کو مس سلمٰی کا اس طرح پاس بیٹھنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ پوچھے۔ "مس سلمٰی آپ نے کبھی بنا بادل برکھا دیکھی ہے؟" وہ جانتا تھا اس کا کیا جواب ہو گا "شٹ آپ۔!" یکایک اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے جھک کر پوچھا "مس سلمٰی چلیں ذرا رنگ روڈ پر ڈرائیو ہو جائے۔ رات بڑی خوبصورت ہے۔"

مس سلمٰی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہونٹ بھینچے ہوئے اس نے دل ہی دل میں دہرایا "رات بڑی خوبصورت ہے! اور تم؟ فلم ایکٹر کا بچہ!" رات بالکل خوبصورت نہ تھی۔ اندھیرا تھا اور ہوا کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ ہوا چیخ رہی تھی اور پشتے سے آگے جمنا کے سینے پر ریت کے ٹیلے تھے اور ان کا کوئی رنگ نہ تھا۔ دور شاید کوئی چتا جل رہی تھی۔ نارنجی اور نیلے شعلے تھے اور پیلے پیلے سائے۔ یہ منظر بھی گزر رہا تھا جس طرح سارے منظر گزر جاتے ہیں۔ کمیش کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے اور وہ ہوا کے زور کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ کس قسم کی ڈرائیو ہے کہ کوئی مجھ سے بولتا نہیں، کوئی میری طرف دیکھتا نہیں۔ کسی کا ہاتھ میرے ہاتھ کو چھوتا نہیں۔ کسی کا سر میرے شانے پر گرتا نہیں، یہ کیسی ڈرائیو ہے اور سڑک جو میری زندگی کی طرح سیدھی اور سپاٹ ہے، اندھیرے میں لپٹی ہوئی جانے کہاں جا رہی ہے۔

آخر اس نے بڑی زور سے بریک دبایا۔ کار سڑک کے کنارے چیختی ہوئی دھچکے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"مس سلمٰی تم سے عشق کرتا ہوں میں۔"

دور جگمگاتی ہوئی روشنیاں یکایک گل ہو گئیں۔ اندھیرا اور زیادہ اندھیرا ہو گیا۔

"آخر یہاں روز رات کو بجلی کیوں فیل ہو جاتی ہے؟"

کمیش کے دل کو کوئی نیبو کی طرح نچوڑے جا رہا تھا۔ جب مس سلمٰی کو یقین ہو گیا کہ اس کے ہم سفر کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے تو اس نے اندھیرے میں مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دوست کا سر اسیٹرنگ پر جھکا ہوا تھا۔ وہ گنگنانے لگی "دلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب۔" روشنیاں پھر جگمگانے لگیں۔ کمیش نے کار موڑی اور ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کار بھگانے لگا۔ اس کے جبڑے جکڑے ہوئے تھے اور ہوا چیخ رہی تھی۔ سلمٰی کی زلف کھڑکی سے باہر جا رہی تھی۔ اور اس کے.....

اس کی پلکوں سے لہو کی طرح ٹپک رہا تھا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ پھول کی طرح کھل رہی ہے۔

اور یہ کوئی ڈرائیو ہے۔ دوسرے کی کار میں جو مجھ سے ہزاروں میل دور ہے۔ یہ ڈرائیو۔ جیسے کوئی اپنی زندگی میں نہیں بلکہ کسی دوسرے کی زندگی میں جی رہا ہو۔

اس نے سیدھی سڑک کو دیکھا جس پر کچھ روشنیاں کچھ پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔

"بس کار روک دو میں یہاں سے خود چلی جاؤں گی۔"

کمیش نے کار روک دی۔ مس سلمٰی جلیس اتر گئی اور بڑی غیریت سے بولی۔

"گڈ نائٹ!"

کمیش نے اس کی گڈ نائٹ کا کوئی جواب نہیں دیا اور آندھی کی طرح کار ڈرائیو کرتا ہوا رات کی پہنائیوں میں گم ہو گیا۔

"بڑا بھولا آدمی ہے یہ کمیش۔" وہ مسکراتی۔ "ڈرائیو بھی بری نہیں رہی۔ رنگ روڈ' اندھیرا۔" اس کے قدم آگے بڑھے' رکے' پھر بڑھے۔

اور وہاں جاکر کیا کروں گی۔ نیند تو اڑ چکی ہے۔ نہیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ تھکن سلادے گی۔ لیکن کاہے کی تھکن بھئی۔ اور پھر نیند نہ آئے تو؟ وہاں کیا ہو گا۔ وہی سنگار میز کونے میں' وہی بیچ میں گول میز جس پر پھولوں سے محروم گل دان مجھے کمیش کی طرح تکے جائے

گا۔ میں ٹانگیں پھیلاؤں گی۔ سگریٹ جلاؤں گی اور چاروں طرف دیکھوں گی۔ دیواروں' دروازوں اور پردوں کے سوا نظر کیا آئے گا وہاں..... اور ہاں وہ کتاب' اس اکیلے انسان کی کہانی جو یونہی جیے جاتا ہے' بے وجہ' لغو زندگی.....

اور میں..... اور پہاڑی رات..... رنگ روڈ پورے شہر کے باہر' باہر دوڑتی ہوئی' سڑک' فاصلہ' اندھیرا..... نہیں..... نہیں' وہاں نہیں۔

وہ احتجاجاً مڑی اور انجلی کے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ راستے بھر جھینگر چیختے رہے اور وہ حیران ہوتی رہی کہ یہ جھینگر کتنے نڈر' بے باک' ضدی اور بے وقوف ہوتے ہیں۔

وہ اپنے کمرے میں نہیں ہو گی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں نہیں ہوتی۔ اس کے عاشقوں کی کمی نہیں۔ سب میری طرح نہیں ہیں۔ وہ ویسے اسکینڈل سے بہت چڑتی تھی۔ لیکن کسی عورت کو کسی مرد سے مسکرا کر بات کرتے دیکھ بھی لیتی تو یہ سوچ کر بڑا مزا آتا تھا کہ چلو آج کل ان کا "چل" رہا ہے۔

انجلی کے کمرے کا پردہ روشن تھا اس نے پردہ اٹھایا اور دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر لگی اس کا جی الجھنے لگا۔ جانے اس کے ساتھ کون ہے۔ میں جانتی ہوں وہ شام ضائع نہیں کرتی۔ لگتا ہے وہ کسی پر اسرار چوراہے پر کھڑی ہے۔ جانے کہاں کہاں سے مسافر آتے ہیں اور اس سے راستہ پوچھتے ہیں اور وہ ان سب کو راستہ بتا دیتی ہے اور آخر میں سب اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ اور میں کہاں کھڑی ہوں۔ جہاں کوئی راستہ نہیں آتا۔ جہاں سے کوئی راستہ نہیں نکلتا.....

دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی تو وہ مڑی' اس نے کمرے میں گلاسوں کے بجنے کی آواز سنی "پی رہی ہے کسی کے ساتھ..... بڑی فلرٹ ہے یہ انجلی!"

دروازہ کھل گیا اور انجلی نے جھجکتے ہوئے پردہ اٹھایا۔

"ارے تم..... کم ان..... کم ان" اس نے مس سلمٰی جلیس کا ہاتھ پکڑ لیا "تم نے نام کیوں نہیں بتایا۔۔ میں تو ڈر گئی۔ آؤ۔ آؤ' جانتی ہو میں اس وقت سوچ رہی تھی کہ تم مل جاتیں تو تمہاری تکا بوٹی کر دیتی۔ وہ کم بخت تمہارا بوائے فرینڈ کمیش' پٹرول والا اور وہ پروفیسر کیا نام ہے اور اس کا' بھلاسا My foot دونوں نے کناٹ پلیس میں ایسا گھیرا' ایسا گھیرا اور کوکا کولہ کے فائدوں پر ایسا لیکچر دیا' ایسا لیکچر دیا..... Scandalous تم کس سوچ میں پڑ گئیں.....!"

کمرے میں ٹیبل لیمپ کی روشنی بہت مدھم تھی' جس پر زرد رنگ کا شیڈ پڑا ہوا تھا۔ مونیکا کی کاسنی ساری جھلملائی اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ میکانکی طور پر اٹھی اور پھر صوفے میں دھنس گئی' انجلی کا چہرہ ستا ہوا تھا اور اس کی ہر حرکت سے بے زاری ٹپک رہی تھی۔ آج کی شام اس نے پھر دھوکا کھایا تھا۔ لیکن وہ اپنی کجلائی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں میں بے نیازی کی کیفیت پیدا کر کے اب تک مونیکا کو دھوکا دیتی رہی تھی۔ مونیکا بہت دکھی تھی۔ اس کے عاشق کی بیوی کلکتے سے واپس آ گئی تھی اور وہ بالکل اکیلی تھی۔

رات جو زہر کے پیالے کی طرح خاموش تھی۔ اس کو گھور رہی تھی۔ مس سلمٰی جلیس کے آنے کے بعد بھی کمرے میں کوئی ہل چل پیدا نہیں ہوئی۔ گھٹن اور تنہائی کچھ بڑھ ہی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ کیا ہوا ہو گا۔ لیکن اس نے اپنی آوارہ لٹ کو بنی ہوئی کٹار بھوؤں سے ہٹاتے ہوئے پوچھا:۔

"کیا ہوا؟"

اس سوال کا جواب نہ مونیکا نے دیا اور نہ انجلی نے۔ مونیکا کے بلاؤز کا گلا بہت بڑا تھا' کافی فیاض..... اس لیے جب وہ صوفے کے نیچے سے کچھ نکالنے کو جھکی تو جیسے روشنی ابل پڑی۔ مس سلمٰی جلیس کا گلا سوکھنے لگا۔ اسے کہتے ہیں عورت کا جسم۔ سورج کی طرح روز ڈوبتا ہے روز ابھرتا ہے۔ لیکن روشنی اور گرمی کم نہیں ہوتی مونیکا نے "جن" کی چھوٹی سی بوتل میز پر رکھی۔ اس کے ناخن بھیگے ہوئے یاقوت کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے دو آدھے بھرے ہوئے گلاس رکھے۔ انجلی نے تیسرا گلاس بھی میز پر رکھ دیا۔ اچھا تو بات یہ ہے ان بوہمین لڑکیوں کو پھر چوٹ لگی۔ پھر کہیں کانچ کا گلاس ٹوٹا۔ یہ سوچ کر مس سلمٰی جلیس کو بڑا مزا آیا۔ اور اطمینان بھی ہوا۔ واقعی یہ بوہمیں اور عیاش لڑکیاں کتنا ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہیں۔ آئینہ چکناچور ہے اور ان کا عکس بھی' ایک میں ہوں۔

انجلی نے لچک کر اور بے وجہ ہنس کر چھوٹا سا جن کا گلاس' جس کا رنگ اورنج اسکواش نے زیتونی بنا دیا تھا' مس سلمٰی جلیس کی طرف بڑھایا اور ہمیشہ کی طرح اسے اپنی دوست کے بڑھے ہوئے نازک ہاتھ پر ابھرتی ہوئی نیلی رگیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔

Drink and forget your misery!

مس جلیس نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

انجلی نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ مس صاحبہ اپنے آپ کو نایاب سینٹ کی

شیشی سمجھتی ہیں۔ بچا بچا کر رکھتی ہیں۔ کاگ بند' مہر بند' اور دیکھو ان کے ہاتھوں کی رگوں کو دیکھو اور آنکھوں کے گرد جھریوں کو دیکھو۔ کیا میں نہیں جانتی کہ اس پھیکی سرخی میں کیسا پھیکا نیلا رنگ چھپا ہوا ہے۔ کمرے میں رکھے ہوئے کیکٹس میں اور میدان میں اگے ہوئے درخت میں بڑا فرق ہے۔ بڑی اسنوب ہے یہ لڑکی لیکن یہ رگیں اور جھریاں' میں اس وقت ٹھیٹھ عورت کی طرح سوچ رہی ہوں۔ یہی ہوتا تھا' مہینے میں اس کمرے میں نہ جانے کتنی بار یہی ہوتا تھا۔ یہ تین لڑکیاں' مونیکا' انجلی اور مس سلمٰی جلیس' گھنائے ہوئے سیاروں کی طرح ٹکرا جاتی تھیں' روتی تھیں اور الگ ہو جاتی تھیں۔ زندگی میں اس کے سوا اور کیا تھا اور کچھ تھا تو تلخ باتیں تھیں' کچھ ٹھنڈے لہولہان تجربے تھے۔ کچھ بغاوت کی تھکی ہوئی خواہش تھی' یہ تھا اور شاید یہ بھی نہ تھا' محض ایسا لگتا تھا۔ رشک اور مایوسی کا سناٹا تھا' اور شاید سناٹا بھی نہیں تھا۔

مونیکا نے یکایک روتے ہوئے کہا "میں اٹھارہ سال کی تھی جب شادی کر دی گئی تھی۔ بھول نہیں سکتی وہ رات۔ اس نے مجھ سے ایک بات نہیں کی۔ اس نے مجھے چھوا بھی نہیں۔ بس ایسا لگا' ایسا کہ کسی نے مجھے دمکتی ہوئی تلوار پر اٹھا لیا ہے۔" اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ دھل رہے تھے اور آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ "اور جب میں اسے چھوڑ کر بھاگی..... اب تو خیر بارہ سال ہو گئے ہیں..... اور اب....."

اس کے آنسو ٹپ ٹپ جام میں گرتے رہے اور وہ آنکھیں بند کر کے جام کو ہونٹوں سے لگاتی رہی جن کی سرخی دھلتی جا رہی تھی۔

مس سلمٰی جلیس کو مونیکا پر بڑا رحم آیا "ہائے یہ ترشے ہوئے ہونٹ! اگر میرے ہونٹ بھی ایسے ہی ہوتے' مسافروں کو پکارنے والے ہونٹ" مس سلمٰی جلیس اور انجلی نے یہ داستان بار بار سنی تھی اور بار بار اسے روتے دیکھا تھا لیکن ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آج تک ایک بار بھی مونیکا نے اپنے عاشقوں سے بے وفائی کی شکایت نہیں کی تھی۔ اور کبھی کسی عاشق نے اس کی حسین آنکھوں کو بھیگتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مس سلمٰی خاموش تھیں۔ وہ جو ایسے موقعوں پر آرٹ اور کلچر کی نزاکتوں پر' انسان کی ازلی تنہائی اور عشق کے المیوژن پر' ڈرامے کی تکنیک اور ہندوستانی ادب میں یورپی ادب کی نقالی پر' بڑے بڑے مفکروں کی ہومو سیکشویل زندگی پر لچھے دار انداز میں بولتی چلی جاتی تھی' اس وقت خاموش تھی۔ بار بار اس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا " مکیش بڑا گدھا ہے لیکن اتنا بڑا نہیں جتنا بڑا انجلی اسے سمجھتی ہے"

"تم کس کے بارے میں سوچ رہی ہو؟" انجلی نے مس سلمٰی سے پوچھا۔

"اپنے بارے میں"..... اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

"اس میں بھلا کیا رکھا ہے!" مونیکا کی آواز ہزاروں میل دور سے آئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

مس سلمٰی کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ اپنے جسم سے لڑ رہی تھی۔ اور جسم کسی اندرونی طوفان سے..... ہاں میں اپنے بارے میں سوچ سکتی ہوں' میں مٹی ہوئی لکیر نہیں ہوں۔ اس کی آواز رندھ گئی اور وہ ہونٹ چبانے لگی۔

"ہر شخص اپنے لیے جیتا ہے اور اپنی خوشی تلاش کرتا ہے' اپنے ڈھنگ سے۔"

مونیکا ہر شخص اپنے لیے جیتا ہے اور اپنی خوشی تلاش کرتا ہے' اپنے ڈھنگ سے۔"

مونیکا کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اس کی ساری شانے سے ڈھلک کر صوفے اور فرش پر بچھ گئی تھی۔ انجلی نے اس کی طرف دیکھا اور بڑی حقارت سے سوچا "جب یہ جھیل نہیں سکتی تو پیتی کیوں ہے۔"

"ذرا تم اس گدھے کی صورت نہیں دیکھتیں"..... مونیکا چلائی "اوگاڈ پیروں پر گر رہا ہے اور کہہ رہا ہے مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ!" مونیکا ہنسنے لگی۔

"ہرگز کوئی تمہارے پیروں پر نہ گرا ہو گا۔ نیچے کھڑا ہوا انسان کھڑی چٹان سے گرتے ہوئے جھرنے کو روکتا نہیں وہ تو....." انجلی نے دل میں کہا' کچھ سوچا اور مس جلیس سے بولی "جانتی ہو میرا دل چاہتا ہے کہ میں پرانے جن پریوں کے قصے والی پری ہوتی۔ ہر رات کوئی مسافر لایا جاتا گبرو نوجوان۔ اس سے شرط بدتی آؤ مجھ سے جو چاہو لے لو لیکن صبح کو ایک پہیلی بوجھنی پڑے گی' نہ بوجھے تو تمہارے دھڑ سے سر جدا ہو جائے گا۔ جس طرح تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گے۔ اور جب اس کا سر اڑتا تو اس سے ایک آن پہلے وہ سوچتا۔ پہیلی نہ بوجھنے میں بھی کتنا لطف ہے..... یہ مرد بڑے گدھے ہوتے ہیں..... کیوں سلمٰی.....؟"

"ہوتے ہوں گے!" مس سلمٰی جلیس نے شانے ہلائے اور اپنے آپ سے پوچھنے لگی "سچ مچ بتاؤ تم کسی مرد کو جانتی ہو؟"

"مجھ سے کبھی کسی مرد نے عشق نہیں کیا۔ اور میں انتظار کرتی رہی۔ پینتیس سال بہت ہوتے ہیں۔ پینتیس سال کا انتظار۔ میں کتابیں پڑھتی رہی۔ ایک بار عرصہ ہوا۔ شاید یہ پچھلے جنم کی بات ہے صرف ایک بار ایک مرد نے مجھے چوما..... اور وہ بھی کس طرح..... بھاگتی گاڑی سے اترتے ہوئے اور پھر وہ نہ ملا۔ نہ جانے کون تھا۔ مجھے یاد بھی نہیں۔ وہ تھی پہلی اور

آخری ملاقات۔ میرے اندر چھپی ہوئی عورت سے کسی مرد کی ملاقات..... اب کچھ یاد نہیں' ہاں اتنا یاد ہے اس کے منہ سے بڑی بڑی تمباکو کی بو آ رہی تھی۔ مرد ہمیشہ میرے پاس سے پرچھائیوں کی طرح گزرتے رہے۔ ڈرتے ہوئے' لرزتے ہوئے..... اور کیمرج کی شام جب میں نے پہلی بار شیری چکھی اور میرا سر چکرایا میں سمجھی نشہ آ رہا ہے۔ میں نے پاس رکھی ہوئی کرسی پر ہاتھ رکھنا چاہا اور میرا ہاتھ ایک بھرے ہوئے شانے پر چلا گیا..... اور وہ اس نوجوان کا شعلے کی طرح اٹھنا اور مجھے ناچ کے بھنور کی طرف لے چلنا..... اور میں سمجھی مجھے نشہ آ رہا ہے۔ ہاؤ فولش'..... شیری سے بھلا کسی کو نشہ آسکتا ہے!"

مونیکا نے آنکھ کھولی۔ انجلی کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے مس سلمٰی کو پہچاننے کی کوشش کی جس کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں۔ اس کے پتلے ہونٹ لرز رہے تھے۔ مونیکا نے بڑے اطمینان سے پرس کھولا اور اس میں سے نیند کی گولیوں کی شیشی نکالی اور ساری گولیاں جام میں گرا دیں اور جام کو نچانے لگی۔ جام ہوا میں ناچ رہا تھا اور..... جام میں شراب' اور شراب میں گولیاں۔ جب انجلی کمرے میں آئی تو وہ جام خالی کر چکی تھی۔

مونیکا آہستہ آہستہ صوفے پر دراز ہو گئی۔

مس سلمٰی جلیس اٹھیں "گڈ نائٹ!"

"یہیں سو جاؤ اس اجاڑ کمرے میں کون انتظار کر رہا ہے۔" انجلی نے تھکی ہوئی آواز میں روکا۔

"نہیں کمرے کو میرا انتظار ہے۔" مس سلمٰی جلیس نے ہمیشہ کی طرح کہا۔

وہ نکلی اور سائے کی طرح اپنے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ جہاں درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی.....

انجلی نے روشنی بجھا دی اور کرسی پر گئی۔

مونیکا کا دل بہت آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا وہ نہ اپنے دل کی دھڑکن سن رہی تھی اور نہ اس دل کی جو اس کی کمر سے نیچے دھڑکنے سے پہلے خاموش ہو گیا تھا۔

نیند کی گولیاں چپ چاپ اپنا کام کر رہی تھیں۔

انجلی اندھیرے میں سوچ رہی تھی "اب کے مونیکا پھنس گئی Poor thing اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا "اور وہ اسنوب کی بچی....."

دوسری منزل پر روشنی جلی اور ایک کمرے میں اجالا ہو گیا۔ انجلی نے مس سلمٰی جلیس کو

اپنی ساری نوچ کر پھینکتے اور بالوں کے کانٹے نکالتے ہوئے دیکھا۔ پھر بجلی بجھ گئی۔ اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ حالانکہ مس سلمٰی جلیس اندھیرے میں دیواروں سے باتیں کر رہی تھی۔

"وہی سنگار میز' وہی کتابیں' وہی گل داں' وہی بستر....."

وہ

بلراج مین را

جب اس کی آنکھ کھلی، وہ وقت سے بے خبر تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا لیا۔ اور سگریٹ نکال کر لبوں میں تھام لیا۔

سگریٹ کا پیکٹ پھینک کر اس نے پھر ہاتھ بڑھایا اور ماچس تلاش کی۔

ماچس خالی تھی۔

اس نے خالی ماچس کمرے میں اچھال دی۔

خالی ماچس چھت سے ٹکرائی اور فرش پر آن پڑی۔

اس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔

بیڈ ٹیبل پر چار پانچ ماچسیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔

اس نے باری باری سب کو دیکھا۔ سب خالی تھیں۔

اس نے لحاف اتار پھینکا اور کمرے کی بتی روشن کی۔ دو بج رہے تھے۔

آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟

ایک بار آنکھ کھل جائے پھر آنکھ نہیں لگتی۔

اس نے تمام کمرہ چھان مارا۔

کتابوں کی الماری، ویسٹ پیپر باسکٹ، پتلون کی جیبیں.... ماچس کہیں نہ ملی۔ اس نے ایک ایک کتاب الٹ دی..... کوئی دیا سلائی نہ ملی۔

کمرے کی حالت بری ہو گئی تھی۔

کتابیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔ کپڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے' ٹرنک کھلا ہوا تھا۔ کوئی آ جائے اس سے۔

رات کے دو بجے..... کمرے کی یہ حالت؟

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے؟

ماچس کہاں ملے گی۔

ماچس کہیں نہ ملی تو.....؟

تو کہیں.....

میرا دھڑکتا ہوا دل خاموش نہ ہو جائے۔

آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی۔

میں وقت سے بے خبر تھا..... ایک بار آنکھ کھل جائے تو پھر آنکھ نہیں لگتی۔

ماچس کہاں ملے گی؟

اس نے چادر کندھوں پر ڈال لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

دسمبر کی سرد رات تھی' سیاہی کی حکومت' خاموشی کا پہرہ۔

کسی ایک طرف قدم اٹھانے سے پہلے وہ چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا رہا جب اس نے قدم اٹھائے وہ راستہ سے بے خبر تھا۔

رات کالی تھی' رات خاموش تھی اور دور دور تا حد نظر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی اور.....

چوراہے پر اس کے قدم رک گئے۔

یہاں تیز روشنی تھی کہ دودھیا ٹیوبیں چمک رہی تھیں۔ لیکن خاموشی جوں کی توں تھی کہ ساری دوکانیں بند تھیں۔ اس نے حلوائی کی دوکان کی جانب قدم بڑھائے۔

ممکن ہے بھٹی میں کوئی کوئلہ مل جائے' دہکتا کوئلہ' دم بہ لب کوئلہ!

حلوائی کی دکان کے چبوترے پر کوئی لحاف میں گٹھڑی بنا سو رہا تھا۔

وہ بھٹی میں جھانکا ہی تھا کہ چبوترے پر بنی گٹھڑی کھل گئی۔

کون ہے؟ کیا کر رہے ہیں؟

میں بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈ رہا ہوں۔

پاگل ہو کیا..... بھٹی ٹھنڈی پڑی ہے!

تو پھر؟

پھر کیا؟ گھر جاؤ!

ماچس ہے آپ کے پاس؟

ماچس؟

ہاں۔ مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔

تم پاگل ہو! جاؤ! میری نیند مت خراب کرو' جاؤ۔

تو ماچس نہیں ہے آپ کے پاس؟

ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے وہ آئے گا اور بھٹی گرم ہو گی جاؤ تم!

وہ سڑک پر آ گیا۔

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

اس نے قدم بڑھائے۔

چوراہا پیچھے رہ گیا' تیز روشنی پیچھے رہ گئی۔ کیا کیا کچھ نہ پیچھے رہ گیا۔

اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔

لیمپ پوسٹ' لیمپ پوسٹ' لیمپ پوسٹ' ان گنت لیمپ پوسٹ پیچھے رہ گئے۔ دھیمی روشنی والے لیمپ پوسٹ جو رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کرتے ہیں۔ یکایک اس کے قدم رک گئے۔ سامنے سے کوئی آ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا!

ماچس ہے آپ کے پاس؟

ماچس؟

ہاں۔ مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔

نہیں میرے پاس ماچس نہیں ہے' میں اس علت سے بچا ہوا ہوں۔

میں سمجھا....

کیا سمجھے؟

شاید آپ کے پاس ماچس ہو۔

میرے پاس ماچس نہیں ہے میں اس علّت سے بچا ہوا ہوں اور اپنے گھر جا رہا ہوں۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔

اس نے قدم بڑھائے۔
سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا کہ تھک گیا تھا۔
وقت سے بے خبر اس کے تھکے تھکے قدم اٹھ رہے تھے۔
لیمپ پوسٹ آتا' مدھم روشنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر سیاہی۔
پھر لیمپ پوسٹ مدھم روشنی' پھر سیاہی۔
وہ لبوں میں سگریٹ تھامے دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا۔
اس کی دور' اندر پھیپھڑوں تک دھواں کھینچنے کی طلب شدید ہو گئی تھی۔
اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔
شب خوابی کے لباس اور چادر میں اسے سردی لگ رہی تھی۔
وہ کانپ رہا تھا اور کانپتے قدموں سے دھیمے دھیمے بڑھ رہا تھا۔ وقت سے بے خبر۔ لیمپ پوسٹوں سے بے خبر...
ایک بار پھر اس کے قدم رک گئے۔ اس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا۔ سامنے پل تھا۔ مرمت طلب پل۔
حادثوں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سڑک کے بیچ ایک تختے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔
اس نے لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ.....
کون ہے؟
وہ خاموش رہا۔
سیاہی کی ایک انجانی تہہ کھول کر سیاہی اس کی طرف لپکا۔
کیا کر رہے تھے؟
کچھ نہیں!
میں کہتا ہوں کیا کر رہے تھے؟
آپ کے پاس ماچس ہے؟
میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو ماچس ہے..... کون ہو تم؟
مجھے سگریٹ سلگانا ہے آپ کے پاس ماچس ہو تو.....

تم یہاں کچھ کر رہے تھے؟

میں لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانا چاہتا تھا..... آپ کے پاس ماچس ہو تو.....؟

تم کون ہو ۔ کہاں رہتے ہو؟

میں.....

کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن!

اور تمہیں ماچس چاہیے..... ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو..... ماڈل ٹاؤن کہاں ہے.....

ماڈل ٹاؤن! اس نے گھوم کر اشارہ کیا۔

دور دور تا حد نظر سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

چلو میرے ساتھ تھانے تک..... ماڈل ٹاؤن.....؟ ماڈل ٹاؤن یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے..... ماچس چاہیے نا! تھانے میں مل جائے گی۔

سپاہی نے اس کا بازو تھام لیا۔

وہ سپاہی کے ساتھ چل پڑا۔

تھانہ اسی سڑک پر تھا جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔

وہ سپاہی کے ساتھ تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں کئی آدمی ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

سب سگریٹ پی رہے تھے۔

میز پر سگریٹ کے کئی پیکٹ اور کئی ماچسیں پڑی ہوئی تھیں۔

صاحب! یہ شخص پل کے پاس کھڑا تھا۔ کہتا ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

کیوں بے؟

اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کر لوں..... مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے۔

کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن! کیا میں آپ کی ماچس لے سکتا ہوں؟

کون ہو تم؟

میں اجنبی ہوں! کیا میں ماچس....

ماڈل ٹاؤن میں کب سے رہتے ہو؟

تین ماہ سے! ماچس.....

ماچس..... ماچس کا بچہ..... اجنبی..... جاؤ اپنے گھر... ورنہ بند کر دوں گا..... ماچس.....

جب وہ تھانے سے باہر آیا۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا۔

اس نے اس نہ ختم ہونے والی سڑک پر دھیمے دھیمے چلنا شروع کیا۔

اس کی ناک سوں سوں کرنے لگی تھی اور اس کا بدن ٹوٹنے لگا تھا۔

سگریٹ پینا ایک علّت ہے!

میں نے یہ علّت کیوں پال رکھی ہے؟

ماچس کہاں ملے گی؟

نہ ملی تو؟

وہ وقت سے بے خبر تھا' لیمپ پوسٹوں سے بے خبر تھا' سڑک سے بے خبر تھا' اپنے بدن سے بے خبر تھا۔

وہ گرتا پڑتا بڑھ رہا تھا۔

اس کے لغزش زدہ قدموں میں نشے کی کیفیت تھی۔

پوپھٹی اور وہ دم بھر کو رکا۔

دم بھر کو رکا اور پھر سنبھلا۔

سنبھلا اور اس نے قدم اٹھانا ہی چاہا کہ.....

سامنے سے کوئی آ رہا تھا اور اس کے قدم لغزش کھا رہے تھے۔

وہ اس کے قریب آ کر رکا۔

اس کے لبوں میں سگریٹ کانپ رہا تھا۔

آپ کے پاس ماچس ہے؟

ماچس؟

آپ کے پاس ماچس نہیں ہے؟

ماچس کے لیے تو میں.....

وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔

آگے' جدھر سے وہ خود آیا تھا۔

اس نے قدم بڑھایا۔

آگے جدھر سے وہ آیا تھا۔

پہیہ

غیاث احمد گدی

تیرہ برس کی عمر میں شادی شدہ لچھو نے جب دیکھا کہ اس کا شوہر ہر رات اس کی بجائے دلاری سے پاؤں دبواتا ہے' اور آدھی رات کو اس کو نیچے فرش پر دھکیل کر لیمپ بجھا دیتا ہے۔ اندھیرے میں صبح تک دلاری اس کے پاؤں دباتی رہتی ہے' تو ایک دن وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی ہے اور پھر لوٹ کر خاوند کا منہ نہیں دیکھتی۔

"پھر کیا ہوتا ہے لچھو؟"

"لچھو نہیں لچھو رانی کہو....." اس نے قطع کلام کرتے ہوئے پہلے نام کی طرف متوجہ کیا۔

"اچھا لچھو رانی پھر تم نے کیا بتایا تھا؟" پھر لچھو رانی کو الفت یکہ وان مل گیا تھا جس نے پنجر کے ایک خالی ڈبے میں ایک گٹھڑی کے ساتھ اسے بھی گٹھڑی بنا نیند میں بے خبر پایا تھا اس نے لچھو رانی کو جگایا اور پوچھا کہ کہاں جاؤں گی تو لچھو نے نیند اور سفر کی تھکان سے ٹوٹے ہوئے جسم کو سیدھا کرتے ہوئے غنودگی کے عالم میں کہا "گھر۔"

"پھر الفت یکہ وان نے مزید کچھ سوال اس لیے نہ کرنا مناسب سمجھا کہ اس کیفیت میں اسے معقول جواب کی قطعی توقع نہ تھی۔ اور یکہ میں بیٹھا کر اپنی جھونپڑی میں ایک بھاری گٹھڑی کی طرح ٹوٹی جھلنگ چارپائی پر پٹک دیا تو وہ چونکی "ارے مجھے کہاں لے آئے ہو؟"

"گھر....." الفت نے اسی سادگی سے کہا اور چولھے کے پاس پہنچ کر آگ جلانے لگا۔

اس کے بعد لچھو نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ لچھو کو ایک گھر چاہیے تھا اور اس کی مختصر سی

زندگی میں..... اس کے خاندان کے پچھلے صدیوں کا روایتی تصور بھی یہی تھا ایک چار دیواری ہو جہاں کوئی ٹوٹی جھلنگ چارپائی ہو نہ ہو ایک چولھا ضرور ہو اور اس کے بعد اگر کسی چیز کی ضرورت تھی تو بس اس کے اندر گھر والا بھی ہو۔ بغیر گھر والے کے گھر کا تصور نامکمل ہوتا ہے۔

الفت کی بیوی سال بھر ہوئے اللہ کو پیاری ہوئی تھی۔ الفت کے گھر میں بن گھرنی کے بھوت کا ڈیرہ لگ رہا تھا' ایسے میں نزول رحمت سے فیض یاب نہ ہونا کفران نعمت ہے۔

لچھو رانی اکثر مجھ سے ازدواجی زندگی سے متعلق ایک بہت پرانی گھسی پٹی مگر حقیقت سے قریب تمثیل پیش کرتی ہے' یعنی زندگی ایک گاڑی ہے اور عورت و مرد اس کے دو پہیے..... لہٰذا دونوں پہیوں کا برابر اور متوازی ہونا از بس ضروری ہے ورنہ قدم قدم پر دھکے ہیں ٹھوکریں ہیں۔

چنانچہ چند ہی مہینوں کے بعد لچھو رانی کو یقین ہو گیا کہ یہ جو زندگی کی گاڑی وقت کی سڑک پر اچھلتی کودتی' اچھلتی پھاندتی جا رہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سڑک ہی خراب ہے بلکہ پہیے کچھ درست نہیں چھوٹے بڑے ہیں اور آپس میں لاگ نہیں کھاتے۔

بقول لچھو رانی کے چند ہی مہینے کے بعد ہر روز وہ اس کی پٹائی کرتا وہ پٹائی کرتا کہ محاورتاً نہیں' سچ مچ اسے اپنی نانی یاد آنے لگتی۔ منہ اندھیرے وہ یکہ لے کر گھر سے نکل جاتا اور رات گئے جب واپس آتا تو شراب کے نشے میں دھت پہلے کھانے کو گوشت روٹی مانگتا۔ جب گوشت کھا چکتا اور روٹی پھینک چکتا تو لچھو رانی کی طرف یوں متوجہ ہوتا گویا دن بھر کا قرضہ اتارنے کا وقت آ گیا ہو۔ پھر جب تھک جاتا تو جھلنگ چارپائی پر یوں پڑ جاتا گویا سارے فرائض پورے ہو گئے ہوں۔ ادھر اطمینان سے اس امید میں پٹنے والی لچھو رانی کہ بعد ازاں عام شوہروں کی طرح محبت بھی کریں گے' دیکھتے دیکھتے جب دیکھا کہ کنویں کا پانی ایک دم سے تارا ہو گیا ہے تو سوچتے سوچتے وہ ایک دن اس نتیجے پر پہنچی کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں رہا۔

اوبڑ کھابڑ سڑک پر چلتے چلتے الفت میاں کے یکے کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا ہے اور اب تو خدشہ ہے کہ کسی دن سواریوں کو لیے دیے دھڑام سے کسی کھڈ میں نہ جا گرے۔

لچھو رانی نے بتایا کہ گدی جی' بس اسی دن سے میں نے یہ جانا کہ یہ چارپائی پر گہری نیند سویا ہوا الفت یکہ وان جس کے ساتھ میں نے اپنی قسمت جوڑی تھی وہ نرا گوشت کا لوتھڑا ہے۔ گوشت کا لوتھڑا۔

"پھر تم نے کیا کیا لچھو رانی؟"

پھر میں کیا کرتی، تھوک دیا اس کے منہ پر اور چلی آئی اس شہر میں.....

جس شہر میں الفت میاں یکہ ہانکتا تھا وہیں اس کا ایک یار رہتا تھا۔ سدو۔ سدو اکثر الفت کے ساتھ اس کے گھر آیا تھا۔ خصوصاً رات کے وقت جب شراب کے نشے میں چور ہوتا۔ وہ یکہ سے اتار کر سہارا دیتے ہوئے اسے چارپائی پر لٹاتا۔ گھوڑی کو کھولتا۔ یکے کو چھجے تلے رکھتا۔ گھوڑی کو سانی لگا دیتا۔ پھر گھنٹہ دو گھنٹہ گھوڑی کو اتنی محبت سے مالش کرتا گویا گھوڑی الفت کی نہیں خود اس کی اپنی ہے۔

مالکانہ احساس کا یہ ارتقاء تھا کہ رفتہ رفتہ اس نے خود لچھو رانی کو اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا۔ جس طرح وہ گھوڑی کو سانی لگاتا، گاڑی کو چھجے میں رکھتا، چاہتا تھا کہ لچھو رانی کی بھی دیکھ ریکھ شروع کر دے۔

بلکہ ایک دن جب لچھو سہ پہر کے وقت چھوٹے سے دھندلے آئینے کی مدد سے ماتھے پر بندیا لگا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ بندیا ٹھیک جگہ پر نہیں لگ رہی ہے لچھو رانی نے کہا "تو منہ کیا دیکھتا ہے لے لگا دے۔"

سدو آگے بڑھ کر بندیا لگانے لگا اور دفعتاً" اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور لچھو رانی نے محسوس کیا کہ بندیا سدو نے صرف پیشانی پر ہی نہیں سارے رخسار پر لگائی ہیں۔

"یہ کیا کر رہا ہے سدو؟"

"کچھ نہیں رانی بندیا....." سدو کی آواز حلق میں ٹوٹنے لگی اور وہ سرمستی کے عالم میں اس کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

لچھو بولی۔ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی گھمن سانپ میری کمر کے گرد لپٹ گیا ہے۔ ذرا دیر کے لیے تو میں ڈری۔ پھر پل بھر میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں نے سدو کو ایسا دھکا دیا کہ وہ چکرا کر زمین پر جا گرا۔ تب میں پھر لپکی اور چاندی کے کڑے والے ہاتھ سے جو پیٹا جو پیٹا کہ اس کے حواس ٹھکانے آ گئے۔

لچھو رانی نے کہا کہ گدی جی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا میں اگرچہ اسے پیٹ رہی تھی اور وہ پٹ رہا تھا مگر مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ اکیلا گھر ہے۔ اور سدو پھر بھی مرد ذات ہے۔ مگر جب دیکھا کہ اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے گھگھیا کر مجھ سے معافی مانگنے لگا تو میرے ہاتھ رک گئے۔ اب کوئی ایسوں کو کیا مارے۔ اس وقت مجھے بڑی شدید نفرت ہوئی اور میں نے اس کے منہ پر بھی تھوک دیا۔

پھر یوں ہوا کہ لچھو رانی نے جس سدّو کے منہ پر تھوکا تھا۔ اس وقت جب اس کو الفت میاں کے کنگلے پن کا احساس ہوا اور ساری دنیا تیرو تار دکھائی دینے لگی تو روشنی کا مینار بن کر جو چیز اس کے سامنے آئی وہ سدو ہی تھا۔

وہ اس رات کے پچھلے پہر جب چاروں طرف ہو کا عالم تھا بلا کھٹکے گھوڑی کے چھجے کے پاس آئی جہاں لید کے پاس ایک میلے ٹاٹ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ سو رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ سے سدو کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے جگایا۔ سدو بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس کے پاؤں پکڑ کر گھگھیانے لگا۔

"نہیں نہیں لچھو اب تو مجھے معاف کر دے بہت ہو گیا اب تو بخش دے۔"

لچھو رانی کو یوں لگا کہ پھر اس کے منہ پر تھوک دے۔ مگر اندھیرے کنوئیں میں یہی ایک رسی تھی جسے تھام کر وہ باہر آ سکتی تھی۔ تو گدی جی' چار برس میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ میرا خاوند نہ رہ سکا۔ اس سے مجھے بچہ بھی ہوا یعنی میری زندگی کے پیڑ میں پھل بھی لگا مگر میں نے برابر یہی سمجھا کیا کہ سدو میرا مرد نہیں میری جورو ہے۔ میری بیوی اور میں اس کا مرد ہوں' جو دن بھر پان کی دکان میں کتھے چونے کا تماشا لگا کر پیسہ بناتی ہوں۔ بازار سے سودا سلف لاتی ہوں۔ اپنے اور سدو کے لیے کپڑے خرید کر لاتی ہوں اور وہ بے چارا دن بھر شریف عورتوں کسی طرح کھانا بناتا ہے۔ کپڑے صاف کرتا ہے' مسالہ پیستا ہے۔ اور کسی کسی دن جب میرا بدن بہت ٹوٹتا ہے تو وہ مالش بھی کرتا ہے۔

یہاں پہنچ کر لچھو رانی شرما جاتی اور آنچل سے منہ ڈھک کر ہنسنے لگتی۔

میں کہتا ساری کہانی میں لچھو رانی یوں تو تم ہر جگہ اپنے عورت پنے کا پتہ چھوڑتی آئی ہو مگر ظاہری طور پر یہیں عورت دکھائی دیتی ہو۔ اپنے دیس کی عورت۔

"کیا اپنے دیس میں عورتیں میرے جیسی نہیں ہوتی ہیں کیا۔ کیا اس کے دو ٹانگیں' دو ہاتھ۔ ناک آنکھیں..... نہیں ہوتیں.....؟

"ہوتی تو ہیں مگر کوئی عورت تمہاری طرح اپنے شوہر کا شوہر نہیں ہوتی اور اپنے شوہر سے بدن نہیں دبواتی۔"

"تو میں کیا کروں۔ وہ نکھٹو ہے بھی ویسا ہی۔"

پھر میں اچانک ایک الگ سوال کر بیٹھتا ہوں۔ "جو بھی سہی پر تم اس کے ساتھ خوش تو ہو؟"

لچھو رانی اس سوال کو سن کر کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر لمبی سانس لے کر میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔ "پتہ نہیں جی' پر ایسا لگتا ہے جیسے مجھے کچھ اور چاہیے۔"

بس یہی وہ مقام ہے جہاں میرا قلم رک جاتا ہے اور اپنے آپ میں یوں الجھ جاتا ہوں جیسے گھنے جنگل میں کھو گیا ہوں۔ لچھو رانی کی گرہستی کی گاڑی بڑے مزے میں چلی جا رہی ہے۔ سڑک بھی ہموار ہے اور دونوں پہیے بھی چھوٹے بڑے نہیں۔ صرف اتنی سی چوک رہ گئی ہے۔ غالباً کہ دائیں طرف بایاں پہیہ لگ گیا ہے اور بائیں طرف داہنا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے بظاہر اس جگہ پہنچ کر کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ یعنی راجہ اور رانی مزے سے رہنے لگے ہیں قصہ ختم اور پیسہ ہضم.....

اگرچہ یہاں تک سوچنے کے بعد بظاہر افسانے کو اختتام تک پہنچا دیتا ہوں مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تخیل طرازی میں مجھ سے کہیں بھول ضرور ہوئی ہے۔ کچھ چھوٹ رہا ہے۔ کوئی کمی پڑ رہی ہے۔ گویا اس گہری زندگی میں کوئی موڑ آنا چاہیے۔کوئی واقعہ۔ کوئی حادثہ..... کوئی۔

چنانچہ میں لچھو رانی پان والی کی کہانی نہیں لکھ پاتا۔ میرے قلم کو' میری روح کو' لچھو رانی کی زندگی سے متعلق کسی انوکھے حادثے کا انتظار ہے۔ یہ حادثہ کب وقوع پذیر ہو گا' کن حالات میں ہو گا' پھر اس سے لچھو کی یکسانیت سے بہنے والی زندگی پر اور بعد ازاں میرے افسانے پر کیا ردعمل ہو گا۔ کیسے ہو گا۔

میں چند ہفتوں کے لیے آفس کے کام سے باہر چلا گیا۔ کام کی کثرت اور نئے لوگوں کے جھمیلے میں لچھو رانی اور اس کا افسانہ زندگی تو کیا میں اپنے آپ کو بھول سا گیا۔ چند ہفتے گزارنے کے بعد جب میں واپس لوٹا تو رات مجھے ملیریا بخار نے آ دبوچا۔ اکیلے گھر میں بخار اور درد کی شدت کے باعث ساری رات اور سارا دن میں نے خود فراموشی کے عالم میں گزار دیا۔ شام ہوتے ہوتے بخار ذرا کم ہوا تو سرہانے لچھو رانی کو پنکھا جھلتے ہوئے پایا۔

"میں نے صبح سویرے تالا کھلا ہوا دیکھا تو معلوم ہوا کہ تم آ گئے ہو..... ذرا دن چڑھ لے تو تم خود آؤ گے سگریٹ پینے۔ باٹ دیکھتے دیکھتے دوپہر ہونے کو آئی بند دروازہ کھلا ہی نہیں تو میرے من میں شک ہوا۔ دیکھا تو تم سچ مچ مردہ سے پڑے ہو۔"

میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "نہیں نہیں اٹھو نہیں۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔"

ڈاکٹر کیسے آیا؟ میں نے گردن گھما کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی "کیا تم لائیں؟"

"نہیں جی ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے کہا اندر چل کر دیکھ لو۔" لچھو رانی نے یوں کہا گویا اپنے کو پس پردہ رکھنا چاہتی ہو۔

دس دنوں تک لچھو رانی نے میری بڑی خدمت کی۔ سارا سارا دن پنکھا جھلتی' ٹھنڈے پانی کی پٹی چڑھاتی۔ دودھ اور ساگودا نہ بنا کر دیتی اور ان سب سے بڑا کام یہ کرتی کہ تنہائی اور اجنبیت کے احساس کو دور دور تک بھٹکنے نہ دیتی۔ بلکہ راتوں کو جب کبھی میری نیند ٹوٹتی تو محسوس ہوتا گویا لچھو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے یا باہر دروازہ پر بیٹھ اونگھ رہی ہے۔

"یہ تم کیا کرتی ہو لچھو! تمہاری دکان اور خراب ہوتی ہو گی اور سدو کی کمر کام سے دوہری ہو جاتی ہو گی۔"

سدو کو میں نے مار بھگایا۔ لچھو رانی نے بڑے اطمینان سے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

آمین۔ میں نے محسوس کیا جیسے لچھو رانی کی گرہستی کی گاڑی دھڑام سے کھڈ میں گر پڑی ہو۔ میں نے پلٹ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بدستور مطمئن تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"ہوا' تم اچھے ہو جاؤ تو بتاؤں گی۔"

لچھو رانی کے لہجے کی طمانیت سے میں بھی مطمئن ہو گیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پاؤں نہیں دبائے ہوں گے۔ بے چارے نے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ اس موئے کی قسمت ہی میں پاؤں دابنے لکھے تھے۔ مرد نام کی تو اس میں چیز ہی نہ تھی۔ میری دکان میں پان کھانے وہ پٹھان آتا تھا نا بڑی بڑی مونچھوں والا۔"

لچھو رانی کی دکان میں بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان پان کھانے کے علاوہ کچھ اور امید میں بھی آتا تھا۔ لچھو رانی محسوس بھی کرتی تھی۔ مگر اتنا بھی نہیں۔ سوچتی جوان آدمی ہے دل لگی کر لیتا ہے۔

مگر ایک روز شام کے جھٹپٹے میں جب دکان میں اور کوئی گاہک نہ تھا اور لچھو رانی گوبر مٹی سے سامنے والا فرش پوت رہی تھی پٹھان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا باتوں باتوں میں نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی اس کی لچھو کو توقع نہ تھی اس نے سنبھالا لیا اور زور سے ایک جھٹکا مار کر

پٹھان کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ اس نے پاس پڑی ہوئی جھاڑو اٹھائی اور ڈپٹ کر بولی۔

"خبردار جو آگے بڑھا۔"

مگر وہ پٹھان تاؤ میں تھا۔ اس نے لپک کر پھر کلائی پکڑ لی اور لگا جھنجھوڑنے۔ لچھو رانی مدافعت کر رہی تھی مگر سدو راہ گیروں کی طرح صرف بیچ بچاؤ کی کوشش میں جٹا ہوا تھا۔

لچھو رانی نے بتایا گدی جی تب میں نے گالی دے دی اور للکارا پاس پڑے ہوئے لوہے کے چھڑے سے دے ایک..... مگر یہ سن کر تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے چھڑا اٹھایا تو ٹھیک مگر اسی وقت پٹھان نے اسے ایک لات رسید کی اور وہ دور جا گرا۔

پھر ارے باپ رے باپ کہتا ہوا وہ جھونپڑی میں گھس گیا جیسے لچھو کا اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو خیر سے راہ گیروں نے پٹھان کو مار بھگایا' ورنہ پتہ نہیں اس دن کیا قیامت گزرتی۔

قیامت تو اس دن گزری جس دن لچھو میرے برتن مانجھ رہی تھی اور میں صحن میں کرسی پر بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا۔ لچھو نے راکھ بھرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو اوپر پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ گھر بھی کتنا سونا سونا لگتا ہے۔ تم شادی کر لو۔"

"شادی تو میری ہو چکی لچھو تم جانتی ہو۔"

"پر بیگم جی یہاں رہتی تو نہیں کیا فائدہ اس شادی کا۔"

میں نے کاغذ سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ گویا میرے حالات سے کافی متاثر تھی۔

"اب دیکھو نا تم اتنا بیمار پڑے۔ کوئی دیکھنے سننے والا نہ تھا۔ اگر تم کو کچھ ہو جاتا تو؟"

"کچھ نہیں ہونے کا۔ ہم کہانی لکھنے والے بڑے بے حیا ہوتے ہیں' پھر تم جو تھیں' کتنا خیال رکھا ہے میرا تم نے۔ تم نہ ہوتیں تو شاید میں اب تک مرکھپ گیا ہوتا۔"

اس نے پلٹ کر کہا "خدا نہ کرے..... تم جگ جگ جیو....."

اس کے پلٹ کر دیکھنے میں' اس کے لہجے میں' الفاظ میں کوئی رمز تھا۔ کوئی راز تھا۔ یہ عام انسانی جذبے سے کچھ اوپر کی چیز تھا۔ مگر میں نہ سمجھ سکا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے چھو کے گزر گیا۔ جھنجھوڑ نہ سکا۔

تیسرے دن وہ میرے یہاں آئی اور میری کتابیں سجاتے ہوئے بولی "جانتے ہو جی لوگ کیا باتیں بناتے ہیں..... کہتے ہیں..... کہتے ہیں..... وہ رک گئی۔

"کیا کہتے ہیں لوگ؟" میں کہانی کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

"کچھ نہیں جی، تم نہیں سمجھو گے۔"

"اچھا" میں نے بے خیالی میں کہا اور افسانوں کی دنیا میں کھو گیا۔

پھر ایک روز شام کے وقت جب چراغ جل چکے تھے اور رم جھم بارش کے باعث فضا خوش گوار ہو رہی تھی، لچھو رانی ایک نہایت خوبصورت ساڑی میں ملبوس چہرے پر پاؤڈر لگائے مخموری چال چل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے آج بہت خوش نظر رہی ہو؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا۔"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟" میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آج لچھو رانی مجھے اجنبی سی دکھائی دے رہی تھی۔

"کچھ نہیں" اس نے ہڑبڑا کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ "میں نے یہ سوچا ہے آج سے میں آپ کے یہاں سویا بھی کروں۔ دن بھر تو، ایک طرح سے رہتی ہی ہوں۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے لچھو رانی....."

"کیوں کا ہے نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارا کھانا بنا سکتی ہوں۔ جھاڑو دے سکتی ہوں برتن مانجھ سکتی ہوں۔ بستر تک تو لگا سکتی ہوں تو پھر یہ کیسے نہیں ہو سکتا۔"

لچھو کی منطق میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر میں نے پلٹ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے فیصلہ کن انداز دیکھ کر اور بھی دنگ رہ گیا۔

"مگر.....مگر۔"

"مگر کیا؟" وہ میری بوکھلاہٹ کا تماشہ مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ "نہیں بھائی میں تو اب یہاں سے ٹلنے والی نہیں۔ کل صبح تک سارے ضروری سامان لے آؤں گی۔"

"لیکن کل میں مہینہ بھر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں" وہ قطع کلام کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ "تب تو یہاں میرا رہنا اور ضروری ہے۔ آخر گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا تمہارے پیچھے۔ جانتے ہو آج کل کتنی چوریاں ہو رہی ہیں۔"

مناسب یہی معلوم ہوا کہ میں فی الحال خاموش رہوں۔ میں نے ایک صندوق میں ضروری سامان رکھا اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

"ارے ابھی سے، جاؤ گے تو کل ہی نا؟"

"نہیں مجھے آج ہی جانا پڑے گا۔" میں نے جیب سے کنجی نکال کر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ "مہینہ بھر بعد آؤں گا۔"

اس کے بعد میں نے اس رات تو ایک دوست کے یہاں قیام کیا۔ دوسرے ہی دن شہر کے دوسرے رخ تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک مکان کرایہ پر لے کر ٹک گیا۔

بہت دن ہو گئے غالباً چھ مہینے گزر گئے۔ لچھو رانی تا حال میرے ذہن پر کھنکھجورے کی طرح قبضہ جمائے ہوئی تھی۔ ایک روز میں بزاز کی دکان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ایک کھلی ہوئی فٹن سے کسی نے آواز دی۔ پلٹ کر دیکھا تو فٹن میں ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "میں ہوں گدی جی، لچھو رانی....."

لچھو رانی! یکایک میرا دل دھک سے ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا گویا میری اپنی زندگی کی گاڑی کھڈ میں گر پڑی ہو۔ لچھو نے نقاب الٹ دی اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"ڈرو مت جی میں نے شادی کر لی۔"

"شادی کر لی لچھو۔" میں نے کچھ ندامت کچھ اطمینان و مسرت سے کہا۔

اس کے چہرے پر بڑا گہرا میک اپ تھا۔ سرخی، پاؤڈر، ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک۔ اس کے جسم سے خوشبو پھوٹ رہی تھی اور مسرت سے اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔

"خوش تو ہو لچھو رانی؟"

"بہت" وہ گویا میرے سوال کی منتظر تھی۔ "میرا خاوند مرد ہے، بزدل نہیں۔ ڈرپوک نہیں۔ اتی بڑی چھاتی ہے اس کی، گدی جی، بھگیڑو نہیں۔"

مجھے معلوم تھا ان سارے تیروں کا نشانہ میں ہی تھا۔ میں نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہا "ہم کہانیاں لکھنے والے بڑے بزدل، بڑے کمزور ہوتے ہیں لچھو تمہاری گاڑی کا پہیہ تو؟"

"کہا نا بہت مضبوط ہے۔" اس نے برجستہ کہا اور نقاب چہرے پر الٹ لی۔ "وہ آ رہے ہیں۔ تم جاؤ۔"

میں گاڑی سے الگ ہٹ گیا۔ ایک بزاز کی دکان سے کپڑے کا پیکٹ لیے ہوئے لمبا تڑنگا سرخ پٹھان جھومتا جھامتا فٹن کی طرف آ رہا تھا۔

ایک زخم اور سہی

مہندر ناتھ

تقریباً رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ آسمان ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔ یہاں سے دور شیوا جی پارک کے قریب سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں چاند کی چاندنی ناریل کے درختوں کو چوم رہی تھی۔ اور میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ کتاب سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔ ایک لڑکی جا رہی تھی۔ لڑکی کی بیک اتنی جاذب نظر تھی کہ اس کی صورت دیکھنے کو جی چاہا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے کمرے سے نکل جاتی' میں چلایا..... سنیئے تو۔" لڑکی مڑی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"آپ نے بلایا؟"

"جی ہاں!"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔

"میں نے کہیں دیکھا ہے آپ کو۔"

"میں آپ کی بلڈنگ کے دوسرے فلور پر رہتی ہوں۔"

"یہ بلڈنگ میری نہیں۔ کیا کام تھا؟"

" میں دیدی سے ملنے آئی تھی۔" لڑکی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میکے گئی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا چاہیے آپ کو؟"

"تھوڑا سا دہی۔" اس نے چھوٹا سا چمچہ دکھاتے ہوئے کہا۔

میں نے چمچہ دیکھا اور پھر میری نگاہیں لڑکی کے سر سے پاؤں تک گھوم گئیں۔ جو کچھ میں دیکھ چکا تھا اس میں گوری رنگت اور لمبی ناک کے سوا زیادہ اضافہ نہ ہوا۔ چھوٹا سا ماتھا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی سی' ذرا ذہین سی۔

"آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"وینا۔"

"نام تو خوبصورت ہے۔ کیا ستار بجانے کا شوق ہے؟"

"شوق تو بہت سے ہیں مگر پورے نہیں ہوتے۔ یوں مجھے سنگیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آپ کون سی کتاب پڑھ رہے ہیں؟"

"ہندی کا ایک ناول۔"

"مجھے پڑھنے کے لیے دیجئے گا؟"

"میرے نام سے واقف ہیں یا میں خود اپنا تعارف کراؤں؟"

"آپ کے ایک دو ناول پڑھ چکی ہوں۔"

"یعنی آپ میری Fan ہیں۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"کچھ سمجھ لیجئے۔ میں نے آپ کو آتے جاتے کئی بار دیکھا ہے۔ اب چلتی ہوں۔ ممی اوپر میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

دراصل وینا کا شمار خوبصورت لڑکیوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں نے زیادہ وقت اس کے جسم کے خموں اور قوسوں پر صرف نہ کیا۔ ایک سرسری سی نظر ڈال کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا کہ اس لڑکی کے بارے میں زیادہ سوچنا' وقت ضائع کرنا ہے۔

ایک دو دن گزر گئے۔ وینا نہ آئی۔ وہ آ بھی جاتی تو کیا ہو جاتا۔ حسب معمول میں رات کا کھانا کھا کے پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتا ہوں۔ میری کھڑکی سے ذرا دور ناریل کے درخت لمبی لمبی گردنیں اٹھائے ہوئے دو دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ نہ آپس میں لڑتے ہیں' نہ جھگڑتے ہیں۔ اس نیلے آسمان کے تلے اس زمین کے اوپر ان دونوں کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہاں جب کبھی ہوا زور سے چلتی ہے تو دونوں دوست اپنی بانہیں پھیلا کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ خوشی سے جھومتے اور گاتے ہیں۔ عین اسی وقت مجھے پھر ہلکی سی چاپ سنائی دی۔

"نمستے!"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے وینا کھڑی تھی!

"ارے آپ.....؟ تشریف رکھیے۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔

وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"نہ دیدی گھر میں ہے! نہ دہی میرے پاس ہے۔ جب سے دیدی میکے گئی ہے۔ میں ہوٹل میں کھانا کھاتا ہوں..... ورنہ دہی کا انتظام فوراً کر دیتا۔"

"میں دہی لینے نہیں آئی۔ آج کتاب لینے آئی ہوں۔"

"آپ کے شوق کی داد دوں گا۔ پوری بلڈنگ میں آپ ہی ایک لڑکی ہیں جسے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ زیادہ تر لڑکیاں یا تو فلمیں دیکھتی ہیں یا آپس میں لڑ کر وقت ضائع کرتی ہیں۔"

"شکریہ اس تعریف کا۔"

"میں تھوڑا بے باک اور نڈر ہوں! اگر آپ برا نہ مانیں تو عرض کر دوں کہ آپ کی باڈی کا نچلا حصہ جو کولھوں' رانوں اور پنڈلیوں پر مشتمل ہے۔ وہ جاذب نظر ہے۔"

وہ چپ رہی۔

"برا مان گئیں؟"

"جی نہیں Thank you for the compliment"

"کونسی کتاب پڑھنا پسند کریں گی؟"

"کوئی اپنی کتاب دیجئے گا؟"

"آپ کی عمر کیا ہو گی؟"

"بس یہی بیس اکیس کی ہو گی!"

"لیکن آپ بیس اکیس سال کی معلوم نہیں ہوتیں۔"

"تھینک یو.....!" بھلا اس وقت تھینک یو کہنے کی کیا ضرورت تھی!

"میں سیکس پر زیادہ لکھتا ہوں۔ یہی میرا پسندیدہ موضوع ہے!"

"مجھے آپ کا انداز بیاں پسند ہے۔ آپ کھل کر ساری باتیں کہہ دیتے ہیں۔"

میں تھینک یو کہنے ہی والا تھا' مگر خاموش رہا۔ لفظوں کو بار بار دہرانا بیوقوفی کی دلیل ہے۔ میں نے الماری سے ایک ناول نکالا اور وینا کے حوالے کیا۔" پڑھنے کے بعد اپنی رائے کا

اظہار کیجئے گا۔"

"ضرور!"

"آپ کالج میں پڑھتی ہیں؟"

"پڑھتی تھی' اب پڑھنا چھوڑ دیا۔"

یہ کہہ کر وینا نے اجازت چاہی۔

.....

اس طرح وینا میرے کمرے میں آنے لگی۔ اب تو وہ دن کو بھی آ جاتی۔ اسے میری اچھی عادت کہیے یا بری۔ میں لوگوں کی تعریف ضرورت سے زیادہ کرتا ہوں۔ یعنی تعریف کرنے میں تنگ دلی نہیں برتتا۔ شاید اسی لیے لوگ مجھ سے بہت جلدی مانوس ہو جاتے ہیں اور دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ شاید میرا برتاؤ وینا کے ساتھ اسی طرح کا تھا۔ جب کبھی میں اس کے قریب جاتا تو وہ فوراً کھڑی ہو جاتی۔ اس کی ناک کے حساس نتھنے پھڑکنے لگتے۔ نہ جانے وہ مجھے اپنے قریب دیکھ کر گھبرا کیوں جاتی تھی۔ میں نے اس گھبراہٹ کی وجہ نہ پوچھی۔

کبھی کبھی دن گزرنے لگتے ہیں تو یونہی گزر جاتے ہیں بغیر کسی حادثے کے۔ کوئی آتا ہے' چلا جاتا ہے۔ دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سورج چڑھتا ہے' ڈھلتا ہے رات آتی ہے' چاند ابھرتا ہے' تارے چمکتے ہیں۔ ناریل کے درخت آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ سیڑھیوں سے لوگ اترتے ہیں' چڑھتے ہیں۔ کوئی کسی کو گالیاں دیتا ہے۔ بچوں پر لڑائیاں ہوتی ہیں۔ عورتیں باہر نکل آتی ہیں۔ ایک دوسرے کو اتنی گندی گالیاں دیتی ہیں کہ اچھی خاصی عورتوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ عورتیں گالیاں بک بک کر تھک جاتی ہیں پھر اپنے کمروں میں چلی جاتی ہیں۔

وینا بھی اسی طرح آتی رہی اور جاتی رہی۔ درد کی لہر نہ ابھری' نہ بڑھی۔ نہ کوئی قریب آیا' نہ دور گیا۔ دل دھڑکا ضرور مگر اس کی رفتار میں تیزی اور تندی نہ آئی۔ بس ایک ہی رفتار سے دھڑکتا رہا۔ جس طرح اسے دھڑکنا چاہیے۔ یعنی محض زندہ رہنے کے لیے۔

پھر ایک دن وینا دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ "ہم یہاں سے جا رہے ہیں!"

"یہ بات خوشی کی ہے یا غم کی؟"

"آپ بتائیے نا!"

"اس بلڈنگ سے باہر چلے جانا ہی خوشی کی علامت ہے۔"

"کیوں؟"

"چاروں طرف اتنی گندگی ہے کہ دم گھٹنے لگتا.....! خیر آپ کب جا رہی ہیں؟"

" چار ماہ کے بعد..... میرے ڈیڈی نے بوری دلی میں ایک فلیٹ خرید لیا ہے۔ وہ فلیٹ تین ماہ کے بعد تیار ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے..... ہم اوپر والا کمرہ خالی کر دیں گے۔ اگر آپ کا کوئی دوست ہمارے کمرے کو لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔"

"کتنا بڑا کمرہ ہے؟"

"آپ کے کمرے سے ذرا بڑا ہو گا۔ بالکنی بھی ہے۔ آپ کمرہ دیکھ سکتے ہیں۔ چلیے نا۔"

"اوپر کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں؟"

"آپ کی ممی؟"

"باہر گئی ہیں۔"

"ڈیڈی؟"

"دفتر۔"

"آپ کا بھائی؟"

"کام پر"

"تو اس وقت آپ اکیلی ہیں؟"

"جی ہاں۔ چلئے اوپر۔"

نہ جانے میں نے کیا دیکھا جس نے مجھے اوپر جانے کے لیے مجبور نہ کیا۔ اکیس بائیس سال کی جوان لڑکی اگر آپ سے یہ کہے کہ چلیے اوپر..... اور ساتھ ہی یہ کہے کہ میں اکیلی ہوں.....! ممی' ڈیڈی اور بھائی سب باہر گئے ہوئے ہیں' تو آپ ضرور لڑکی کے ساتھ جائیں گے لیکن میں نہ گیا۔ آپ سمجھ گئے نا میری بات؟ لڑکی میں کچھ ہونا چاہیے۔ شاید اس میں سب کچھ تھا جو مجھے نظر نہ آیا اور جو کچھ مجھے نظر آیا وہ نہ ہونے کے برابر تھا!

"پہلے یہ بتاؤ پگڑی کیا ہو گی؟"

"بس یہی پندرہ ہزار روپے۔"

"تو پہلے میں کسی دوست سے بات چیت کر لوں۔ پھر اطلاع دوں گا۔"

وہ منہ لٹکائے چلی گئی اور میں کرسی میں دھنس گیا۔ میں سوچتا زیادہ ہوں' عمل کم کرتا ہوں۔ سوچنے کا عمل بہت مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دنیا سب سے مشکل کام سوچنا ہے اور

جو کچھ میں نے سوچا تھا ٹھیک ہی سوچا تھا۔

.....

تین مہینے گزر گئے۔ ایک بار پھر وینا آئی اور کہنے لگی۔ "کل ہم جا رہے ہیں۔ یہاں سے جانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ کیا کروں۔ والدین مجبور کر رہے ہیں۔ وہ جگہ بہت کشادہ ہے۔ مکان صاف اور ستھرا ہے۔ اس بلڈنگ کی طرح گندہ نہیں۔ پھر بھی....."

"پھر بھی کیا....."

"جی نہ لگے گا۔"

"کیوں؟"

"بچپن کی سہیلیاں یہیں رہتی ہیں..... وہاں شاید دل نہ لگے۔"

"دل لگانے کی کوشش کیجئے گا۔"

"کوشش تو کروں گی۔ مگر یہ نامراد دل کسی کی سنتا نہیں' اپنی ہی کرتا ہے۔ میں فون کروں گی آپ کو۔ آپ جواب تو دیں گے نا؟"

"بھلا تم فون کرو اور میں جواب نہ دوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وینا؟" میں نے بات بڑھانے کی کوشش کی۔

"آپ فریب دینا خوب جانتے ہیں۔" شاید وینا کو جو کچھ کہنا تھا اس نے کہہ دیا لیکن میں کب چوکنے والا تھا۔

"میں تمہیں فریب نہیں دے رہا ہوں' اپنے آپ کو فریب دے رہا ہوں وینا! زندگی میں زندہ رہنے کے لیے میں نے ایک ہی نسخہ نکالا ہے جو بے حد کار آمد ہے!"

"کیا؟"

"جینے کے لیے اپنے آپ کو فریب دو!"

شاید وہ میری بات نہیں سمجھی۔

"اب اجازت چاہوں گی۔" اور وہ چلی گئی۔

افسانہ یہاں بھی ختم ہو سکتا تھا مگر یہاں ختم نہ ہوا۔ چند مہینے گزر گئے۔ وینا کا ایک دو بار فون آیا۔ ایک بار اس نے کہا۔ "مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔" میں نے کہا۔ "کہو!" کہنے لگی۔ "فون پر نہیں آپ کے گھر آ کے۔" میں نے کہا۔ "چلی آؤ۔"

پھر ایک دن وینا آ گئی۔

"دیدی کہاں ہے؟"

"دوسرے کمرے میں۔"

پہلے دیدی سے بات چیت کر لوں۔ پھر آپ سے گفتگو کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں گئی۔ آدھ گھنٹے کے بعد واپس آئی "آپ سے مشورہ لینا ہے۔ آپ عمر میں بڑے ہیں مجھ سے۔ تجربہ کار بھی ہیں۔ پندرہ دن ہوئے میرے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو بلوا نہ سکی۔ معذرت چاہتی ہوں۔ اس شادی میں ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ بس love at first sight والی بات ہو گئی۔"

"یہ تو خوشی کی بات ہے اب شادی کر لو۔"

"شادی نہ ہو سکے گی۔"

"کیوں؟"

"وہ پنجابی ہے اور ہم سندھی"

"تو کیا ہوا.....؟ پہلے یہ بتاؤ لڑکا تمہیں پسند ہے؟"

"ہاں۔"

"وہ تمہیں پسند کرتا ہے؟"

"بہت!"

"نوکر ہے؟"

"ہاں۔"

"کہاں رہتا ہے؟"

"دلی میں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"اب میں کیا کروں.....؟"

"پہلے تم اسے خط لکھو....."

"میں اسے خط نہ لکھوں گی۔ پہلے وہ خط لکھے....."

دیکھو دینا! ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے اپنی زندگی برباد نہ کرو۔ ہاں! اگر تم اس کے خط کا انتظار کرنا چاہتی ہو تو کر لو۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ تمہیں خط لکھے گا۔ اپنی محبت کا اظہار کرے گا۔ شادی کے لیے کہے گا۔ تمہیں خط کا جواب دینا چاہیے۔ اپنی محبت کا اظہار کرنا۔ اگر واقعی

تم اس لڑکے کو چاہتی ہو تو شادی کے لیے ہاں کر دینا....."

"یہ شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ وہ پنجابی ہے اور میں سندھی! میرے والدین نہ مانیں گے۔"

"میں تمہارے والدین بات کروں گا اور انہیں منا لوں گا۔"

"خیر، پہلے تو یہ کیجیئے گا کہ ان کے خط آپ کے ایڈریس پر آئیں گے۔ اور وہ خط آپ مجھے دیں گے۔"

"تو آپ مجھے پوسٹ بکس اور پوسٹ مین کا رتبہ دے رہی ہیں۔ شکریہ اس عزت افزائی کا۔"

"اتنا کام تو میرے لیے کیجئے۔" وینا نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کیا حضور....."

.....

اب خط آنے شروع ہوئے۔ تقریباً ہر روز ایک خط آتا! سات دنوں میں سات خط آئے۔ ان سات دنوں میں وینا کا کوئی فون نہ آیا۔ میں عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔ نہایت ہی بے وفا سی لڑکی ہے۔ خطوں پر خط آ رہے ہیں اور وینا کو ان خطوں کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں۔

اچانک ایک دن وینا کا فون آیا۔ "کیا کوئی خط آیا؟"

"اجی ایک خط! خطوط کا ایک انبار جمع ہے میرے پاس!"

"آپ نے خط پڑھے؟"

بھئی واہ! عشق آپ فرما رہی ہیں اور خط میں پڑھوں! اور میں تمہارے عاشق کے خط کیسے پڑھ سکتا ہوں۔ آخر مرد ہوں۔ رشک، حسد اور جلن کا جذبہ ابھر آیا تو؟"

"آپ کو اجازت ہے ان کے خط پڑھنے کی بلکہ خط پڑھ کر مجھے مشورہ دیجئے گا۔"

"کہ عشق کیسے کیا جاتا ہے؟" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہاں، ہاں..... آپ تو اس لائن کے ماسٹر ہیں! میں آپ کے عشق کے قصے کافی سن چکی ہوں۔"

"بد سے بدنام برا!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"خط پڑھ کر بتایئے گا کہ جواب کیا دوں؟"

"یعنی لیٹر Writing میں بھی آپ کو سبق سکھانا پڑے گا۔"

"نہ جانے کیا سیکھنا پڑے گا مجھے۔" وینا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اس قیامت کا سامنا مجھے ہی کرنا پڑے گا..... چلئے۔ منظور! جہاں اتنے زخم کھائے ہیں ایک زخم اور سہی!" میں نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

.....

میں نے خطوں کو پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں خط پڑھتا گیا' رشک وحسد کا جذبہ بڑھتا گیا۔ دماغ بھنبھنانے لگا۔ خطوں میں گہرائی نہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا ایک teenager دوسرے teenager کو خط لکھ رہا ہے۔ لکھا تھا۔ "ڈارلنگ.....! میں تم سے پیار کرتا ہوں' بے حد پیار کرتا ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں تمہارا ہو گیا۔ جب پہلی بار میری انگلیاں تمہاری انگلیوں سے مس ہوئیں تو سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ جب پہلی بار تمہارے ہونٹوں کو چوما تھا تو یوں محسوس ہوا جیسے گلاب کے پھولوں کو چوم رہا ہوں جب پہلی بار تم نے میری آغوش میں اپنا سر رکھا تھا تو میں نے اس وقت سوچا شاید ساری دنیا کا خزانہ مجھے مل گیا.....!" اس طرح ہر خط میں اپنی محبت کا تذکرہ تھا ایک خط میں لکھا تھا..... "اب تمہیں کیا بتاؤں۔ تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔ جی چاہتا ہے پہلی فلائٹ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں اور تم سے باتیں کروں! اب میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ شادی کروں گا تو تمہارے ساتھ۔ ورنہ زندگی بھر اکیلا رہوں گا۔ کسی دوسری لڑکی سے شادی نہ کروں گا! میں نے اپنے والدین سے بات چیت کر لی ہے۔ یہ لوگ کافی فراخ دل ہیں۔ پنجابی اور سندھی میں کوئی فرق نہیں مانتے۔ اب تم اپنے پتا جی اور ماتا جی سے بات کر لو..... اور جلدی جواب دو کہ اس کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ اگر تم میں اتنی جرأت نہیں تو میں تمہارے پتا جی کو خط لکھے دیتا ہوں اور ان سے اجازت منگوا لیتا ہوں۔ آخر تمہارے پتا جی انکار کیوں کریں گے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ کسی دوسرے کو ہماری راہ میں حائل نہ ہونا چاہیے۔ میں نے تمہیں سات خط لکھے اور جواب میں تمہارے صرف دو خط آئے۔ ڈارلنگ.....! ہر روز مجھے خط لکھا کرو۔ تمہارے خط پڑھ کر ہی میں زندہ رہ سکوں گا!" ایک اور خط میں لکھا تھا..... "ڈارلنگ! جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو اس وقت تم مجھے دبلی سی معلوم ہوئیں۔ اب تمہاری صحت کیسی ہے؟ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ زیادہ کھاؤ۔ کسی ٹانک کا استعمال کرو۔ ذرا موٹی ہو جاؤ نا۔ مجھے دبلی پتلی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ اب کیا بتاؤں اس وقت

کیا چاہ رہا ہوں یعنی تمہیں اپنی بانہوں میں لے لینے کے لیے جی بے تاب ہے۔ برا نہ ماننا میری بات کا۔ صحت مند ہونا کوئی بری بات نہیں! اپنے دل کا تو یہ حال ہے کہ اس کو زخموں سے سیے جا رہا ہوں۔ ڈارلنگ! سچ بتا دوں تمہیں کہ تمہاری جیسی اس دنیا میں اور کوئی نہیں! جلدی سے اپنے والدین سے بات کر لو شادی کی۔ آخر میں یہی عرض کرتا ہوں کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ صرف تمہیں چاہتا ہوں! کسی اور کو نہیں!"

ان خطوں کو پڑھ کر میرے دل و دماغ پر اچھا اثر نہ پڑا۔ یونہی رشک' حسد اور جلن کا جذبہ ابھر آیا۔ بھلا مجھے ان خطوں سے کیا تعلق تھا۔اگر وینا کسی کو چاہتی ہے تو کرلے محبت؟ یا وینا کو کوئی لڑکا چاہتا ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔ خط بہت بے ہودہ تھے۔ صرف پیار' پیار' پیار! اور کچھ بھی نہیں! انہی خطوں کی وجہ سے میرے ذہن میں ایک خلفشار سا پیدا ہوا۔ ایک دو خط اور آئے میں نے پڑھے نہیں۔ کافی دنوں بعد وینا کا فون آیا۔ "میں آ رہی ہوں!"

میں نے کہا "بصد شوق!"

جب وہ آئی تو وہ خط میں نے وینا کو دیے۔ وہ خط پڑھتی گئی۔ جب سب خط پھاڑ چکی تو کہنے لگی۔ "کیا گھٹیا عشق ہے!"

"بولو۔ اس سے اچھا عشق اور کیا ہو گا....." میں نے کہا۔

"اجی بس پیار' پیار' پیار! اور کچھ نہیں۔ خط کا آغاز ڈارلنگ سے اور اختتام تمہارا عاشق رنجن!..... میں کیا جواب دوں۔ ایک دو خط لکھ چکی ہوں۔ ایک خط گھر کے ایڈریس پر آ گیا۔ اگر پتا جی اسے پڑھ لیتے تو مجھے گھر سے نکال دیتے۔ کیا بے ہودگی ہے۔ میں انہیں لکھ چکی ہوں کہ وہ خط آپ کے اڈریس پر لکھے۔ پھر میرے گھر کے پتے پر کیوں خط لکھا؟"

"نشے میں لکھا ہو گا۔"

"کیسا نشہ؟"

"عشق کا نشہ وینا!"

آپ ان خطوں کے انجام سے واقف ہیں۔ اگر میرے پتا جی کو ان خطوں کا علم ہو گیا تو مجھے گھر سے باہر کر دیں گے۔ پھر میں کدھر جاؤں گی.....؟"

"میرے پاس چلی آنا!"

"مذاق نہ کروں جی!"

"بولو۔ میرے پاس رہنے میں کیا قباحت ہے؟"

"مگر دیدی۔" اچانک وہ چپ ہو گئی۔ "میں ایک عجیب جھنجھٹ میں پھنس گئی ہوں۔" وہ بولی۔

"بات کیا ہے.....؟"

"میری اور رنجن کی شادی نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں؟"

"آپ خط تو پڑھ چکے ہیں۔"

"ان خطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں اس لڑکے کے سوا کسی اور سے شادی نہ کرنی چاہیے۔ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ تم اس سے پیار کرتی ہو۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے' نوکر ہے اور کیا چاہیے؟"

"ماتا پتا نہیں مانتے..... میں نے پوچھ لیا ہے ان سے۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟"

"میں آتم ہتیا کر لوں گی!"

"میں کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"یہی تم مجھے دھوکا دے رہی ہو۔"

"دھوکا! اور آپ کو.....؟"

"وینا! میں تم سے بڑا ہوں۔ میری شادی ہو چکی ہے۔"

"تو کیا ہوا.....؟"

ہوا یہ کہ جو خط تم نے پھاڑ ڈالے' وہ تمہارے عاشق کے نہیں تھے۔ وہ خط تم نے لکھے تھے۔"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" وینا کے رخسار ہلدی کی طرح زرد ہو گئے۔

"ہاں' ہاں جو کچھ کہہ رہا ہوں' درست کہہ رہا ہوں۔ شروع میں جب تمہارے عاشق کے خطوط آنے لگے تو میں انہیں اصلی خط سمجھتا رہا۔ نہ جانے ان خطوں کو پڑھ کر میرے دل میں رشک کا جذبہ کیوں ابھرا۔ میرے من میں کھوج کا احساس جاگا۔ میں ایک جاسوس سا بن گیا اور میری نظر مہروں پر پڑی۔ میں نے مہروں کو دیکھا' پرکھا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ خط دلی سے پوسٹ نہیں کیے گئے تھے' بمبئی سے پوسٹ کیے گئے تھے۔ لفافوں پر کہیں بھی دلی کی مہر نہ تھی۔ تم اس

کی تصدیق چاہتی ہو؟ اس دن مجھے احساس ہوا کہ تم کسی کو نہیں چاہتیں' مجھے چاہتی ہو!"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں!!" وہ روتے ہوئے کہنے لگی..... "بھلا میں آپ کو کیوں چاہوں گی۔ آپ میرے کیا ہوتے ہیں۔ کیا آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں؟ اتنے دن میں آپ کے پاس آتی جاتی رہی کبھی آپ نے پیار کا ایک جملہ مجھ سے کہا؟ میں رات کے دس بجے آپ کے کمرے میں آئی۔ آپ نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو میرے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ نہ ہونے دیا۔ میں نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا' آپ نہ آئے۔ میں جانتی ہوں آپ مجھے نہیں چاہتے۔ مجھ سے نفرت کرتے ہیں! اور جب آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں' تو میں آپ سے کیوں محبت کروں؟ مجھے آپ سے محبت نہیں' بالکل محبت نہیں!" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

"رونے سے کیا ہو گا؟"

"دیدی کہاں ہے؟"

"فلم دیکھنے گئی ہے۔"

"دیکھو وینا! کسی کو چاہنا بری بات نہیں۔ محبت ایک انمول جذبہ ہے' زندگی کا خوشنما پھول! تمہاری محبت کی قدر کرنے لگا ہوں۔ پہلے میں تمہیں نہیں چاہتا تھا۔ اب چاہنے لگا ہوں۔ لیکن یہ پیار کا پھول ایک صحرا میں کھلا ہے۔ یہ پھول ایک چشمہ کی طرح ہے' جس سے تمہاری پیاس نہ بجھ سکے گی۔ کیا تمہارے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں۔ میں تم سے عمر میں بہت بڑا ہوں اور میں زندگی کے ایسے موڑ پر کھڑا ہوں جس کا اگلا قدم موت ہے! کیا پیار کے اظہار سے تمہارے تشنگی نہ مٹے گی؟ اور پھر دیدی....."

"بس بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے' جو ملنا تھا مل گیا۔ شاید ان چند لفظوں میں آپ نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے' جس کا برسوں سے مجھے انتظار تھا.....!" یہ کہہ کر وینا کمرے سے روتی ہوئی اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی!!

کینڈل کالونی

اقبال متین

(مقام اور کردار سب قطعی فرضی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو سامان کی فہرستیں اور لکھنؤ والوں کو اصلی سمجھ سکتے ہیں)۔

اس پیاسی اور بنجر دھرتی کی مانند جس پر بادل اُمڈ اُمڈ کر چھائے تھے لیکن تیز ہواؤں نے انہیں اڑا کر کہیں اور برسنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ کوئی ان محبتوں کے لیے جو دوسروں سے اس کو نہیں ملتی ہیں ترس تو سکتا ہے لیکن ابا کی ایک اور محرومی تھی۔ وہ آدمی جو اپنی ہی محبت بے دریغ دوسروں پر لٹانا چاہے لیکن نہ لٹا سکے' ایسی محرومی جو سناٹا بن کر آدمی کے دل میں بس جاتی ہے۔

مایوسی سمجھئے جیسے بادل اُمڈ اُمڈ کر اٹھتے ہوں' جھوم جھوم کر چھاتے ہوں لیکن برس ہی نہ پاتے ہوں اور ان کے وسیع سینے میں چھپا ہوا ٹھنڈا میٹھا پانی کنکر بن کر ان کے اپنے سینے کا بوجھ بن جاتا ہے۔

ابا کے سینے میں اس کا بے پناہ جذبۂ محبت اس طرح گھٹ گھٹ کر ایک بوجھ بن گیا تھا۔ ابا ساری کینڈل کالونی کا ابا تھا۔ میں بھی کرایہ کے نئے ناتے اس کی اولاد معنوی میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا تھا۔ پہلے پہل جب مجھے ابا سے سابقہ پڑا تھا تو اس نے مجھے کانچ کے سامان کی دکان سے اٹھائے ہوئے مٹی کے مادھو کی طرح برتا تھا! مالک دوکان نے اگر شیشے کے سامان میں مجھے بھی سجا دیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور؟ لیکن خریدار نے مجھے ہی قصوروار ٹھہرایا کہ میں اس دوکان کا اہل نہیں تھا۔ میرے اس جرم کی ابا نے مجھے خوب خوب سزا دی۔

میرا جرم یہی تھا کہ میں شہر کے بیچ میں جہاں رہنے کی تمنا میں بڑے بڑے کھاتے پیتے لوگ اپنی موٹروں کے ٹائر گھستے پھرتے تھے لیکن انہیں رہنے کو اس کالونی میں مکان نہیں ملتا تھا۔ وہاں میں موٹروں کے ٹائر نہیں اپنے جوتے گھستا پھر رہا تھا۔ ابا نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا تھا۔ پھر پیر سے سر تک۔ وہ بلا کسی کی شرکت کے ساری کالونی کا مالک تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ چھوٹے بڑے خوب صورت سے کوارٹر اور ان میں سجے ہوئے رنگ برنگ کے سامانوں کے درمیان شیشے کے بنے ہوئے نازک نازک لوگ! یہ تھے ابا کے کرایہ دار جو موٹروں میں اڑتے تھے اور فرش پر جوتے پہن کر چلتے تھے۔ کالونی کی اسی کانچ کی دنیا میں میں بھی اپنے مٹی کے گھروندے کا سارا سامان لے کر چلا آیا۔ اور یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکا جب ابا نے مجھے الٹ پھیر کر اچھی طرح پرکھ لیا کہ میں کہیں سے ٹوٹا پھوٹا نہیں ہوں۔ مجھ میں کوئی کسر نہیں ہے۔ گھر کے لیے میری ضرورت اور حاجت مندی یقیناً ایسی ہے کہ اس کالونی میں وہ حصہ جو بھائیں بھائیں کرتا ہوا پڑا ہے اور سبھی نے چھوڑ دیا ہے مجھے دیا جا سکتا ہے۔ مجھے ابا نے اس کے باوجود تین چکر کٹوائے اور جب میں نے مایوس ہو کر اس ضمن میں ملنا چھوڑ دیا تو وہ خود مجھے شہر کے پرانے بازار میں اپنی لمبی چوڑی قیمتی سی کار میں بیٹھا ہوا ملا۔ خود اس کے بلانے پر جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا۔

"کیوں صاحب آپ کو مکان نہیں چاہیے۔"

مجھے ایسا لگا جیسے ابا سر راہ کسی غریب کو چھیڑ رہا ہے۔ اس کی ٹوپی اچھال رہا ہے۔ میں باوجود کوشش کے یہ نہ کہہ سکا کہ مولانا تین روز بلاناغہ میں آپ کے دیدار کے لیے حاضر نہیں ہوا تھا۔ میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ لہٰذا میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس باچھیں کھل کر رہ گئیں۔ میری زندگی کی ایسی ضرورت پوری ہو رہی تھی جس ضرورت کا اندازہ اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں تھا۔ وہ جو فرش اور عرش پر، شیشے اور پتھر میں، ڈال اور پات پر، آگ اور پانی میں، کانٹے کی نوک اور پھول کی پنکھڑی میں، جہاں چاہے جس وقت رہ سکتا ہے تو اس کے لیے مکان کی قلت کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اس لیے یہ مسئلہ تو صرف غریب بندوں کے ہی حصے میں آیا ہے جس کی نسبت آپ اس کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتے اور اس لیے میں نے ابا کو ایسی محبت کی نظر سے دیکھا جس سے احسان مندی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ اس لیے کہ وہ میری زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کر رہا تھا جس کا وعدہ اللہ میاں نے نہیں کیا ہے کہ گھر کوئی رزق تو نہیں ہے۔ اب میں کینڈل کالونی میں خلاء کے مسافر گگارین کی طرح اس اندازے سے آیا جیسے فاتح زمان و

مکان ہوں اس لیے کہ میں نے ابا کا دل جیت لیا تھا جس نے مجھے اپنی کالونی میں رہنے کے لیے ایک "فلیٹ" دیا ہے۔

کینڈل کالونی میں مجھ سے کم درجہ کا کوئی شخص نہیں تھا۔ درجے کا تعین میں نے موٹر اور کتے سے کیا ہے۔ قریب قریب ہر ایک کے پاس ایک موٹر اور ایک یا دو کتے ضرور تھے۔ یہ کتے دن کو کالونی میں اپنے مالکوں کے خلاف کانفرنس کرتے اور رات کو اس ذہنی ریاضت سے تھک کر اس طرح سو رہتے جیسے جانتے ہوں کہ آپس ہی میں ایک کا مالک دوسرے کے مالک کے گھر میں نقب لگانا چاہتا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے سے ڈرا ہوا بھی ہے۔ کالونی کی تقسیم اور جائداد کے بٹوارے کے سلسلے میں یہ مخالفتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ایک کا مالک دوسرے کے مالک سے رات کے اندھیرے میں نہیں ملتا تھا۔ کتوں کو باہر کے کسی راہ زن کا کھٹکا نہ تھا جو کبھی اپنی نیند خراب کر کے رکھوالی کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ وہ جانتے تھے کہ کینڈل کالونی میں سارے کے سارے رہنے والے لوگ ان کے اپنے مالک ہی کی تعریف میں آتے ہیں' اس لیے کہ یہ سب کے سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اگر ان میں کوئی ان بن ہو بھی جائے تو کتے اس جھگڑے فساد میں کوئی رول ادا کرنے میں نمک حرامی سمجھتے۔ اس لیے ان میں بھی محبت اور پیار بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی کانفرنس میں اپنے مالکوں کے نیک و بد اعمال کا نہ صرف جائزہ لیتے بلکہ انہیں "ذہنوں" میں ریکارڈ بھی کر لیتے۔ کتوں کے ان سارے مالکوں کا ابا جیسے سرغنہ تھا اس لیے بھی کہ اس کے پاس کتے بھی زیادہ تھے اور موٹریں بھی زیادہ تھیں اور فی الوقت تو ساری کالونی کا' جیسے کہ میں نے کہا تھا بغیر کسی کی شرکت کے مختار تھا۔

شروع شروع میں جب کینڈل کالونی کے رہنے والوں میں شامل ہوا تھا تو سمجھتا تھا کہ دوسرے سارے لوگ بھی میری طرح سے صرف کرایہ دار ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ ایرانی علی حسین جو اپنی بیوی کو سات پرتوں میں چھپا کر رکھتا ہے' اس بیوی کو جس کے جسم پر سفید چمڑی تو ہے لیکن گوشت نہیں ہے' وہ ابا کا کرایہ دار ہے اور ہاں میرے فلیٹ سے بالکل لگی ہوئی سندھی عورت بھی جو اپنے بھاری بھر کم دوہرے بدن کے بل بوتے پر اپنے شوہر کو چھورا کہہ کر بلاتی تھی' ابا کی کرایہ دار تھی۔ اس عورت کا اکلوتا چھوٹا سا لڑکا بڑا پیارا سا تھا لیکن بے انتہا شریر بھی! وہ کینڈل کالونی کے سارے بچوں سے یکے بعد دیگرے لڑتا جھگڑتا بھی تھا اور جب اس کے خلاف کالونی کے بچوں کا مشترکہ محاذ قائم ہو جاتا تو وہ دوسرے بچوں سے پٹ کر اپنی ماں سے جا چمٹتا اور سارے بچوں کی شکائتیں کرتا۔ پہلوان قسم کی سندھی عورت پہلے تو اس

کی پیٹھ پر دوہتڑ مارتی' پھر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنے فلیٹ سے نکل کر ایک ایک بچے سے لڑتی' بچوں کی ماؤں سے الجھتی۔ بات بات پر اپنے بچے کے اکلوتے ہونے کا ذکر کچھ اس طرح کرتی جیسے یہ اس کی بدنصیبی نہیں بلکہ کوئی کارنامہ ہو' جو اس نے صرف ایک بچہ جنا اور پھر اپنے شوہر کو "چھورا" پکارنے لگی!

"تمہارے دو ہیں' میرا تو ایک ہی ہے! تمہارے تین ہیں! میرا تو ایک ہی ہے' تمہارے کتنے سارے ہیں' میرا تو ایک ہی ہے!"

ایک انسپکٹر کی بیوی نے' جو اس کالونی میں موٹر کے بجائے موٹر سائیکل پر ہی اکتفا کرتا تھا' سندھی عورت سے ایک دن کہا "بہن جی تمہارا ایک ہی ہے تو دوسرا چپکے سے پیدا کیوں نہیں کر لیتیں۔ کالونی بھر میں چیختی پھرتی ہو..... میرا تو ایک ہی ہے..... مجھے تو ایک ہی ہے..... تم کہو تو اپنے شوہر سے کہوں؟....."

یہ تو خیر گزری جو سندھی عورت نے بات نہیں سمجھی ورنہ "انسپکٹر" کی بیوی بے چاری تو یوں بھی چلتی کیا تھی' ہواؤں میں ڈولتی تھی اور وہ بھی اس طرح جیسے پتنگ تھاپ کھاتی ہو۔ سندھی عورت کے دوچار بوسے بھی اسے انتقام کے لیے کافی تھے لیکن سندھی عورت نے یا تو بات سنی نہیں..... یا پھر سمجھی نہیں۔

کینڈل کالونی کی ایک مشہور شخصیت جو ساری کالونی کے ذہنوں میں رات کی گہری تاریکی کے ساتھ ساتھ ابھرتی تھی اور پو پھٹتے ہی اجالوں کے ساتھ محو ہو جاتی تھی' وہ "انسپکٹر" کے چھوٹے بھائی کی شخصیت تھی۔ یہ ایک معمولی سا لونڈا تھا جو ابا کا قریبی رشتہ دار ہونے کے ناطے ساری کالونی کا رشتہ دار تھا۔ لیکن بلا کسی اجازت کے بغیر جھجک ہر گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سندھی عورت' ایرانی علی حسین' دودھ والے غفور میاں اور مجھ سے اس کا رشتہ نہ تھا' ویسے ساری کالونی سے اس کا ناتا یقینی تھا۔ یہ لڑکا ہندوستان بھر میں پھر کر گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا رہتا لیکن روٹی کے انتظام کے لیے ہر دوسرے تیسرے ہفتے کینڈل کالونی ضرور آتا اور اندھیرے کی طرح لوگوں کے ذہنوں پر چھا جاتا۔

کینڈل کالونی کا ہر گھر اس کا کفیل ہوتا اور وہ اس طرح کہ وہ وقفے وقفے سے ہر گھر میں ہاتھ صاف کرتا رہتا۔ مال مسروقہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی سیاہی کی مدت مقرر ہوتی۔ کینڈل کالونی سے قدم باہر نکال کر جب اس نے قرب و جوار میں اپنی ہاتھ کی صفائی کی مشق کا آغاز کیا تو انسپکٹر بے چارہ سرکاری وردی سے سرکاری پستول نکال کر سرکاری جوتوں سمیت اس کے سینے پر

چڑھ بیٹھا اور اپنے فرض کی ادائیگی میں بھائی ہونے پر بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اور اسے اچھی طرح جتلا دیا کہ جو کچھ کرنا ہو بس کینڈل کالونی میں کیا کرو۔ اس لیے کہ کالونی کا ہر گھر اس کا اپنا گھر ہے وہاں کے رہنے والے اس کے اپنے لوگ ہیں۔ ان کی ہر چیز اس کی اپنی ہے۔

خدا معلوم اس لونڈے کو اس بات کا پتہ کیسے چل گیا کہ میں بھی کینڈل کالونی کے مالک کو جو ساری کالونی کا ابا ہے' ابا کہہ کر پکارنے لگا ہوں۔ بس اتنا معلوم ہونا تھا کہ اس نے میرے گھر کو بھی اپنا گھر سمجھا۔ اور ان دنوں جب میں ملازمت کے سلسلے میں دورے پر کسی ضلع پر گیا ہوا تھا' گھر کے پچھلے حصے کے ایک روشن دان سے داخل ہو کر جو بھی اسے مل سکتا تھا' اٹھا لے گیا۔ اس مسروقہ سامان کی فہرست اس لیے نیچے درج کر رہا ہوں کہ اگر آپ یہ سامان برآمد کرنے کے آمادہ ہوں تو سب کا سب میں آپ کی نذر کر دوں! میں آپ کی اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ اس لونڈے کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے ہاتھ میں دے دوں۔ سامان اس سے آپ اگلوا لیں اور خوشی سے اسے اپنے گھر میں محفوظ رکھیں اور یہ کام آپ بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کا فلیٹ یا گھر کینڈل کالونی میں نہ ہو اور آپ ابا کے رشتہ دار نہ ہوں ورنہ یہ لونڈا رشتہ داری کے سہارے ہمیشہ بخشا گیا ہے۔

سامان کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ ایک جرمن ٹیبل گھڑی

۲۔ ایک تھرمس جس کا کاگ نہیں ہے

۳۔ ایک پاندان (جرمن سلور)

۴۔ ایک عطردان

۵۔ ایک کافی سیٹ

۶۔ ایک چشمہ

۷۔ ایک نمبری عینک

۸۔ دو پتلونیں

۹۔ ایک قمیض

۱۰۔ ایک فاؤنٹن پن

۱۱۔ کلپنا کے تین "ساریکا" اور "دھرم یگ" کے دو دو پرچے

۱۲۔ "داستان گو" کا کہانی نمبر اور ادبِ لطیف کا سال نامہ

۱۳۔ ایک اردو کتاب۔ باپ بیٹے

۱۴۔ ایک انگریزی کتاب..... یامہ دی پٹ

۱۵۔ ایک پھٹی ہوئی کتاب.... انٹی میسی (سارتر) کا گردپوش

۱۶۔ گیارہ سگریٹ کی ڈبیاں جن میں کچھ خالی ہیں۔

۱۷۔ سوڈے کے تین شیشے جن میں ایک بھرا ہوا تھا۔

۱۸۔ وہسکی کا ایک "نپ" جو میں نے تفریحاً" پینے کے لیے رکھا تھا۔ اور کچھ بھی ہو گا جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔

دودھ والے غفور میاں کی نسبت تو میں نے آپ کو کچھ بتایا ہی نہیں۔ مڑے سینگوں کی چکنی چپڑی سیروں دودھ دینے والی نئی بھینسیں غفور میاں کا کاروبار بڑھانے کے لیے خود تشہیر کا باعث تھیں۔ لوگ ان بھینسوں کو دیکھ کر ہی ان کے دودھ کا تصور کر لیتے اور ان کی نظروں میں ملائی اور مکھن سے بھرے سپنے سا جاتے۔ غفور میاں بڑی احتیاط اور بڑے اہتمام سے دودھ گاہکوں کے سامنے ہی دوہتے اور ان کا یہ ہنر کوئی دیکھ نہ پاتا کہ اپنی کمر کے گرد لپٹے ہوئے سائیکل کے ٹیوب سے جس میں پانی بھرا ہوتا ربر کی نلی لگا کر وہ کس طرح دودھ میں میٹھا اور شفاف پانی ملا دیتے ہیں۔ اس انسپکٹر کے "فلیٹ" کے نچلے حصے میں دو بوڑھیاں بڑی مشکل کی حالت میں رہتی ہیں۔ یہ ابا کے مرحوم بھائی کی نشانیاں ہیں جنھوں نے کبھی اچھے دن ضرور دیکھے ہوں گے۔ لیکن اجالے سے اندھیرا جس طرح بھاگتا ہے آج کل ان بوڑھیوں سے اچھے دن اسی طرح بھاگتے رہتے ہیں۔ اور اس بھری پری کینڈل کالونی کی دنیا میں جہاں موٹروں کی چکا چوند ہے یہ بوڑھیاں اپنی تین چار بطخوں' چار چھ مرغیوں اور ایک سیاہ بکری کے پیچھے صبح سے شام تک بڑے خشوع خضوع سے اس طرح مصروف رہتی ہیں جیسے جانتی ہوں کہ کینڈل کالونی کے سارے افراد خاندان اپنی بطخوں اور مرغیوں کے سہارے چمکتی موٹروں تک پہنچے ہیں۔ یہ بوڑھیاں انسانوں کی بستی میں روحیں معلوم ہوتی ہیں۔ جو اپنا ماضی ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ ابا نے غفور میاں کے پاس ایک بھینس خرید کر چھوڑ رکھی ہے۔ وہ معاوضہ میں روزانہ تین پاؤ دودھ ابا کو دیتا ہے اور نصف سیر کا ابا نے ان بوڑھیوں کے لیے بندوبست کروا دیا ہے۔ ایک دوسرے کی نظر بچا کر یہ بوڑھیاں کبھی کبھی اپنے حصے سے زیادہ دودھ پی جاتی ہیں اور پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں ہی کے مرحوم شوہر اپنی قبروں سے اٹھائے جاتے ہیں پھر سلائے جاتے ہیں۔ پھر اٹھائے جاتے ہیں لیکن دوسرے دن دودھ کا راتب ملنے سے پہلے دونوں شیر و شکر ہو چکی ہوتی ہیں۔ اور ابا کے

دودھ میں سے پاؤ بھر دودھ نکال کر اس اتنا ہی پانی ملا دیتی ہیں۔

میرے "فلیٹ" کے بائیں طرف ابا کا ایک اور قریبی رشتہ دار میجر رشید الدین خاں رہتا ہے۔ یہ غالباً ابا کے کسی مرحوم بھائی کی چہیتی بیٹی کا چہیتا شوہر ہونے کے ناتے ابا کا بھی پیارا ہے۔ ابا کو ویسے کالونی کا ہر فرد پیارا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالونی کے کسی بھی فرد کو ابا کے پیار اور محبت کی ضرورت نہیں ہے اور جس چیز کی ضرورت انہیں ہے وہ ابا جانتا ہے! لیکن ابا اصولوں کا آدمی ہے! وہ وقت کے انتظار میں ہے تاکہ ان لوگوں کو وہ ساری چیزیں دے دے جن کی قیمت ان کی نظروں میں ابا کے پیار سے کہیں زیادہ ہے۔

میں تو آپ کو میجر رشید الدین خاں کے متعلق بتا رہا تھا کہ ابا بیچ میں آ دھمکا۔ ابا کی شخصیت کچھ ایسی من موہنی ہے کہ آپ کینڈل کالونی کا ذکر کریں تو اس کالونی کے چپے چپے پر ابا چھایا ہوا نظر آئے گا۔ گھر گھر میں ابا کی پرچھائیں دکھائی دے گی۔ ابا کی جو مرکزیت ہے وہ کچھ اس طرح کی ہے کہ ابا کے وجود کو کینڈل کالونی سے ہٹا لیجئے تو اس ساری کالونی کے پرخچے اڑ جائیں گے' اس کالونی کی حدود میں ایک آدمی دوسرے آدمی کی صورت بھی نہیں پہچانے گا! کاغذ' قلم اور کرچھے' بھالے لے کر لوگ کالونی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا بٹوارا کرنے کے لیے کبھی ایک دوسرے سے جھپٹیں گے کبھی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ عدالت کے دروازے کی مماثلت سے ہی میں نے اس ہنگامہ آرائی کی فضاء میں کاغذ اور قلم کا نام بھی لیا ہے ورنہ کاغذ اور قلم کا یہاں کیا کام۔ میں کہنا یہی چاہتا تھا کہ ابا کا وجود ہٹ جائے تو پھر اس افراتفری' اس بغض و عناد' اس آتش و بارود کی فضاء میں جہاں بھائی بھائی کو دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے' جہاں خاندان کی بڑی بوڑھیاں کھنڈروں سے آئی ہوئی روحوں کی طرح اپنا ماضی تلاش کرتی پھرتی ہیں' وہاں آدمی' آدمی کو کس طرح پہچان سکتا ہے؟ اور میرے کان آنے والے وقت کے وہ دھماکے سن رہے ہیں جب کینڈل کالونی جیوں کی توں دھری رہ جائے گی لیکن حرارت اس سے چھن جائے گی جو زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں پارک ہونے والی موٹریں اپنی روشنی جلا جلا کر ایک دوسرے کو گھوریں گی لیکن پہچان نہ پائیں گی۔ کالونی کے کتے ایک جگہ جمع ہو کر "کانفرنس" کریں گے اور جب ان کو موت کے سناٹے ساری کالونی میں رینگتے نظر آئیں گے تو وہ انہی سناٹوں سے بھوں بھوں کر کے زندگی کی بھیک مانگیں گے۔

ابھی میری کینڈل کالونی کے رہنے والوں کو یہ نہیں معلوم ہے کہ ایک "محبت" کی موت ایک "معاشرے" کی موت ہوتی ہے اور اس موت و زندگی کے درمیان ابا کا وجود ایک ربطِ باہمی

بنا ہوا ہے بالکل اسی طرح جیسے ساری کالونی کے رہنے والے کسی گہری کھائی کے اٹوٹ اندھیرے میں کالونی سمیت ڈوب جانے کے لیے اپنا سارا زور بازو لگا رہے ہوں..... صرف اس تصور میں کہ اس گھاٹی کی تہہ میں جواہرات کی ڈھیریاں چھپی ہیں۔ اور ابا بے چارہ تن تنہا ساری کینڈل کالونی کو ایک مضبوط رسی میں باندھے کھائی کے کنارے کھڑا ہوا کالونی کو اوپر اٹھانے کے لیے آخری بار اپنا سارا زور' اپنی ساری قوت لگا رہا ہے' لیکن رسی ٹوٹ جانے کا ڈر ہے! مجھے ایک ڈر اور بھی ہے رسی ٹوٹنے سے پہلے ابا کی سانس ٹوٹ جائے تو..... اس لیے کہ وہ تن تنہا کنارے پر کھڑا ہانپ رہا ہے اور اس کے دست و بازو شل ہو گئے ہیں۔

میں پھر کہاں سے کہاں نکل آیا ہوں۔ میں تو آپ سے میجر رشید الدین خاں کی بات کرنے چلا تھا۔ میجر رشید الدین خاں کالونی بھر میں سب میں مقبول ہے۔ میجر مرنجان مرنج شخصیت کا مالک ہے آپ اس سے سوائے رعب کے کسی بھی عام موضوع پر بات کر سکتے ہیں وہ آج کل مختلف قسم کا بیوپار کرتا ہے۔ آدمی تیز ہے۔ زمانے کے سرد و گرم کا شعور رکھتا ہے۔ کالونی کی ملکیت پر اپنے تمول کی بنیاد نہیں رکھتا۔

پولیس کارروائی کے بعد اس کو حیدر آباد فوج سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن آج فوجی افسر کی کوئی نشانی اس کے پاس نہیں ہے۔ میں نے اتنے وسیع الملاقات آدمی کم ہی دیکھے ہیں۔ طرح طرح کے لوگ اس سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ ملنے جلنے والوں کو دیکھ کر کسی کی اپنی انفرادیت اور شخصیت کے تعلق سے کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے۔ لیکن میجر رشید الدین خاں کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس لیے کہ اس کے پاس دوست' اہل معاملہ ایک ہی ڈھب سے آتے ہیں۔ تالی بجتی ہے اور میجر کھڑکی سے سر نکال لیتا ہے۔ ایک بار ایک رکشے میں ماہئی بے آب کی طرح تڑپتی ہوئی ایک عورت میجر کے پاس لائی گئی تو میں حیران ہو گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ میجر چھری ہاتھ میں لیے سورج کی جانب رخ کر کے' آنکھیں بند کیے جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہا ہے اور چھری پر پھونک مار کر نہایت احتیاط سے عورت کے ننگے پیٹ پر چلیپے بنا رہا ہے۔ جو بن نہیں رہے ہیں اس لیے کہ عورت کا پیٹ کوئی کاغذ نہیں ہے اور میجر کی چھری بھی کوئی قلم نہیں لیکن وہ جوں جوں ایسا کرتا جا رہا ہے عورت کی تڑپ سکون میں بدل رہی ہے۔

میجر رشید الدین خاں نے دوسری جنگ عظیم میں سنگاپور میں جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر جو زندگی گزاری ہے اس کی داستان جتنی طویل ہے اتنی ہی دردناک بھی ہے۔ فی الوقت اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ میجر رشید الدین جس کے چہرے کو دوسری جنگ عظیم نے مسخ کر رکھا

ہے' موت سے اس طرح آنکھیں ملاتا رہا ہے کہ موت ہمیشہ اس کے آگے نجل نجل رہی ہے۔

کینڈل کالونی کی خصوصیت کو آپ کے سامنے رکھنا میرے لیے بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ اس کالونی میں مجھے قدم قدم محبتیں ملتی ہیں' چھوٹوں سے' بڑوں سے' ہم عمروں سے' لیکن اس کے باوجود ان محبتوں کو محبت کہتے ہوئے میں ڈرتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ کالونی میں ساری محبت کی عمر بھی ایک ساعت دیدار سے کم ہوتی ہے جبکہ ایک ساعت دیدار اسی جہاں میں ساری عمر کی محبت ہو سکتی ہے لیکن میں ان مختصر ترین محبتوں کو طول دینے کا گر جانتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ ان محبتوں میں اگر کوئی شے حائل ہے تو کینڈل کالونی۔ اپنی مشترکہ جائداد کی صورت میں یہ کالونی یہاں بسنے والے افراد خاندان کے دلوں میں ایسے "انجکشن" لگا رہی ہے جن سے محبتوں کے نشے اتر رہے ہیں! آدمی کے اندر ڈھکے چھپے ایسے جذبے بیدار ہو رہے ہیں جو محبتوں کی عمر کو گھٹاتے ہیں اور اسے آہستہ آہستہ بڑے سلیقے سے قتل کر دیتے ہیں۔

ابا کا ایک چھوٹا بھائی ہے جسے کالونی کے اکثر لوگ چچا پکارتے ہیں۔ ابا کے اور اس چچا کے درمیان کینڈل کالونی سب سے زیادہ حائل ہے۔ ابا جس سمت دیکھتا ہے چچا اس سمت دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اس مرکز پر جسے دونوں ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں' دونوں کی نظریں جا ملتی ہیں۔ لیکن چچا کی بیوی جسے کالونی کے سارے لوگ چچی کہہ کر نہیں پکارتے' بڑی ہی سمجھ دار اور طرح دار عورت ہے۔ ابا اور چچا کی مخالفتوں کے باوجود وہ بزرگ ہونے کے ناتے ابا کا بڑا احترام کرتی ہے۔

مجھے اس کالونی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ ایک خوبصورت سے خواب میں ہر شے کو سجا کر ابا کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ اس سجاوٹ کے نیچے ابا کی نظر نہ جا سکے۔ چچا کی بیوی جسے سب چاچی نہیں کہتے کچھ اس قسم کا رول دوسروں سے زیادہ ہی ابا سے ادا کرتی ہے۔

چچی کی بیٹی کا حسن کالونی کے باہر بھی دور دور مشہور ہے! اس شہرت میں سچ پوچھئے تو چچی کی بیٹی کے حسن کو دخل کم ہے اور شخصیت کو زیادہ!

آج شخصیتیں کچھ اس طرح جذب توجہ ہوتی ہیں کہ انہیں دیکھتے رہنے میں بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ غور کیجئے تو ان میں وہ کشش ان کے غیر معمولی حسن کی بنا پر نہیں ہوتی جبکہ وہ اتنی حسین ہیں ہی نہیں۔ چچی کی اس بیٹی کا حسن اس کی وضع داری اور پندار کے باعث نکھرتا ہے۔ وہ نظریں جو دنیا بھر کو دیکھ لینے کا جتن کرتی ہوں لیکن اپنی نگاہ کو بقول غالب نگاہ بننے نہیں دیتیں۔ کالونی کی یہ حسینائے دل نواز' کالونی کے ابا اور کالونی کے چچا یعنی اس کے اپنے ابا اور

اس کے اپنے چچا کے نفاق کو بھی اسی نگاہ غلط انداز سے دیکھا کرتی ہے جیسے راہ میں پڑے طالب دیدار کو۔

ابا کے وہ دن سنہری تھے جن دنوں ابا کی چہیتی بیوی زندہ تھیں۔ ابا کو اس ایک ہستی میں دنیا بھر کی محبت مل گئی تھی۔ اس معمولی شکل و صورت نے واقعی کالونی بھر کے دلوں پر حکومت کی تھی۔ ابا تو ظاہر ہے ایسے میں فاتح زمانہ تھا جس نے اس عورت کا دل جیت لیا تھا جس کے قبضے میں اس کے ہر چھوٹے بڑے ملنے والے کا دل تھا۔ لیکن جب اس عورت نے زندگی ہی سے ناتہ توڑ لیا تو اس کی بے پناہ ایثار و محبت نے ابا کے ویران دل میں محرومیوں کی ایک دنیا آباد کر دی اور اب ابا ہر جھوٹی محبت کے پیچھے آنکھیں بند کیے دیوانہ وار دوڑتا نظر آتا ہے اور وہ ساری محبتیں جو کینڈل کالونی کی سونا اگلنے والی جائداد کے سہارے آج تک جوں توں زندہ تھیں' بیمار ہو کر آخری سانسیں لے رہی ہیں تو ابا بوکھلا گیا ہے۔ وہ کالونی کے سناٹوں میں پازیب کے چھناکوں کو سننا چاہتا ہے' وہ ویرانیوں میں زندگی کی ہما ہمی کا متلاشی ہے' وہ کینڈل کالونی میں ایک ایسا دیا جلائے بیٹھا ہے جس کی جوت کالونی کے ہر رہنے والے کو دوسرے کے دل کا راستہ دکھا سکے۔ لیکن لوگ اس جوت کے سہارے ایک دوسرے کے دل میں داخل ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے دل سے نکل کر کالونی ہی میں جمع ہو رہے ہیں۔

جب کبھی ابا یہ دیکھ لیتا ہے کہ اس نے جو دیا جلا رکھا ہے اس کی لو اتنے سارے کالونی کے رہنے والوں کی یورش سے کانپ اٹھتی ہے تو وہ ان سبھوں کو ساتھ لے کر کینڈل کالونی ہی سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سیروتفریح کے لیے نئے نئے دل کش مقامات پر ان سب کو لے جاتا ہے' بے دریغ خرچ کرتا ہے۔ ہنسی خوشی' مسکراہٹیں' قہقہے' ترنگ' ولولے' غل غپاڑہ' کھیل تماشے کالونی کا چھوٹا بڑا ہر شخص جب اس کے اطراف میں خوش اور مطمئن ہوتا ہے تو ابا کے چہرے کا روپ دیدنی ہوتا ہے۔ وہ سر تاپا ایک دیا بن جاتا ہے جس کی بتی تیل کے آخری قطرے تک جلنا چاہتی ہو اور اپنی اس پل بھر کی روشن زندگی سے مطمئن ہو جس کے اطراف پروانے رقصاں ہوں۔

ابا کے بعد کینڈل کالونی کا جو کچھ ہو گا وہ تو میری نظر میں ہے لیکن ابا کے بعد اس ابا کا کیا ہو گا جو کبھی نہیں مرے گا۔

ایک روز میرا بدن شدید بخار سے پھنک رہا تھا۔ ان دنوں گرمیاں شدید پڑ رہی تھیں۔ ابا میری عیادت کو آیا۔ اپنے ایئرکنڈیشن والے کمرے سے نکل کر میرے فلیٹ تک آتے آتے اس

کا چہرہ تمازت سے دمک اٹھا تھا۔ اس نے خیر خیریت پوچھی اور میرے پاس بیٹھ گیا تو میں نے پنکھا اس کے ہاتھوں میں تھما دیا تاکہ وہ شدید گرمی کو نہیں گرمی کے احساس کو دور کر سکے۔

کہنے لگا فلیٹ تو بھٹے کی طرح تپتا ہے۔ اس فضاء میں تم بھلا کیا تندرست ہو سکو گے۔

میں نے ازراہ مذاق کہہ دیا "آپ ہی کا تو فلیٹ ہے' ایک بجلی کا پنکھا یہاں بھی لگوا دیجئے نا.... ساری کالونی میں ایک میرا ہی فلیٹ پنکھے سے محروم ہے۔"

شام کو اس کی موٹر فلیٹ کے سامنے رکی تو وہ خود ٹیبل فین اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور کچھ ایسی پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے پنکھا میرے فلیٹ پر نہیں مال سرحد پار پہنچا رہا ہو۔

لوٹنے لگا تو بڑی لجاجت سے مجھ سے کہنے لگا "کسی سے بتانا مت کہ یہ پنکھا میں نے تمہیں دلایا ہے۔"

"کیوں نہیں بتاؤں گا.... یہ تو آپ کی عنایت ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

"میرے لوگ برا مانتے ہیں" وہ مسکرایا۔

"پنکھے پر صرف کی ہوئی رقم محفوظ رکھی جاتی تو میرے بعد کل تقسیم میں انہیں کے کام آتی۔ سمجھے کچھ!"

اَدّھا

گلزار

سب "ادھا" کہہ کے بلاتے تھے۔ پورا کیا! پونا کیا! بس ادھا..... قد کا بونا جو تھا۔ پتہ نہیں کس نے نام رکھا تھا۔ ماں باپ ہوتے تو ان سے پوچھتا۔

جب سے ہوش سنبھالا تھا' یہی نام سنا تھا اور یہ بھی نہیں کہ کبھی کوئی تکلیف ہوئی ہو۔ دل دکھا ہو۔ کچھ نہیں۔ ہر وقت اپنی مستی میں رہتا تھا۔ خربوزے والے نے کہا۔ "ادھے' ذرا دکان دیکھیو' میں کھانا کھا کے آیا۔" اور ادھا بڑے مزے سے ڈنڈی ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتا اور ہانک لگاتا۔ "آجا' مصری کے ڈلے ہیں!۔"

وہ کبھی خربوزے بیچتا' کبھی کھجوریں۔ نانی کو ویدجی سے ہاضمے کی دوا لا کر دیتا' تیسری منزل والے کیشوانی کی بچی کو سکول چھوڑ کے آتا اور مادھو مستری کو کبھی مزدور نہ ملتا تو وہ اینٹیں ڈھونے کا کام بھی کر لیتا۔ مگر سب سے زیادہ مزہ آتا اسے بارات کے آگے ناچنے میں۔ بارات چاہے کسی کی بھی ہو' بھولے بھٹکے بھی ادھر سے گزر جاتی تو وہ اپنے اس ایک میل کے علاقے میں آگے آگے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جھلاتا' چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر تھرکتا ناچتا چلا جاتا۔ اس روز وہاں سے ورق کوٹنے والے الیاس کی بارات نکلی تو وہ حسب عادت' آگے آگے ناچتا ہوا چلنے لگا۔ پنڈت نے ٹوکا بھی۔ "ابے ادھے! مسلمان کی بارات میں ناچ رہا ہے؟۔"

ہوا میں ہاتھ جھلاتے ہوئے ادھا بولا۔ "ڈھول تو دونوں ہی کے بجتا ہے۔ اور ایسے ہی بجتا ہے!"

ادھا' بارہ سال کے بچوں میں کھیلتا تو انہی جیسا لگتا۔ جب بچے سکول چلے جاتے تو وہ

سوسائٹی کے بیچ والے باغ میں بوڑھے مالی کے ساتھ مل کر نیم کی سوکھی پتیاں جمع کرتا اور رات کو پروفیسر صاحب کی بیٹھک سے ماچس لا کر اس میں آگ لگا دیتا۔

ایک بار پروفیسر صاحب نے اسے ایک پرانا کوٹ دیا۔ ادھے نے باہر آ کر دیکھا' اور اسے مالی چاچا کے حوالے کر دیا۔ "۔بوری کی بوری دے دی پہننے کو۔ اس میں تو میرے جیسے تین آ جائیں۔"

چھتر پور سوسائٹی کی پانچ بلڈنگوں میں رہنے والے اسی کنبوں کے لگ بھگ ساڑھے تین سو آدمی تھے۔ اور ادھا "ج" ' "خ" کے نقطے کی طرح ان سب میں گھومتا رہتا۔ کسی کا کام اس کے بغیر رکتا نہیں تھا مگر اس کے بغیر چلتا بھی نہیں تھا۔ ادھا نہیں تھا تو جیسے وہ پورے نہیں تھے۔ جیسے بھرے پرے گھر کو پالتو بلی کچھ اور بھر دیتی ہے' ایسے ہی اس نے چھتر پور سوسائٹی کو کچھ اور بھر دیا تھا۔

لیکن کل وہ ان سب کو خالی کر گیا' غریب کر گیا۔ کمپاؤنڈ میں جمع بھیڑ کو پروفیسر نے چلا کر کہا تھا "تم سب ادھورے ہو' ادھے ہو۔ اور جسے تم ادھا کہتے ہو' دیکھو' دیکھو وہ کتنا پورا ہے' کتنا مکمل!۔"

یہ بات چاہے کل کی ہے' مگر اصل بات شروع ہوئی تھی دو سال پہلے۔ اصل بات سے پہلے بھی ایک بات ہوئی تھی اور وہ بھی کچھ کم اصل نہیں تھی۔ مگر اس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

چھتر پور سوسائٹی کی سب سے خوبصورت لڑکی رادھا کملانی اس دن ہیر گنج کے علاقے سے آ رہی تھی کہ تین غنڈوں نے اسے گھیر لیا۔ ایک نے آنکھ ماری' دوسرے نے سیٹی بجائی اور تیسرا کندھے کا گھسہ دے کر آگے نکل گیا۔ لڑکی سہم گئی۔ دور گلی کے سرے پر اسے ایک سایہ سا نظر آیا اور وہ زور سے چلائی "ادھے!....."۔

اس نے آواز سنی تو بھاگا آیا۔ رادھا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ادھے' ذرا مجھے گھر تک پہنچا دے۔"

ادھے کو بات سمجھتے دیر نہیں لگی۔ شیر ہو گیا۔ رادھا کی بانہہ پکڑ کے بولا "چلئے.....میں ہوں نا۔"

اور وہ ان تین غنڈوں کے بیچ میں سے رادھا کو یوں نکال کر لے گیا جیسے ہوا کا جھونکا نکل جائے۔

مگر اس رات ادھے کو نیند نہیں آئی۔ پہلی بار اسے لگا کہ اس کی عمر اٹھائیس برس کی ہے۔ اگلے دن سے اس نے سکول کے بچوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا اور کپڑے استری کروا کے پہننے لگا۔ تبدیلی لوگوں نے بھی دیکھی اور رادھا نے بھی! وہ صرف ہنس دی "ہاؤ کیوٹ!۔"

ادھے کو جیسے زندگی میں نیا کام مل گیا۔ باڈی گارڈ کا! محافظ کا! رادھا کو اچھا لگتا۔ وہ صبح اسے کالج تک چھوڑ کر آتا' کبھی کبھی کچھ کتابیں بھی اٹھا لیتا..... کبھی شام کو پہنچ جاتا' واپسی میں ساتھ لے کر آتا ..... لیکن ایک دن رادھا نے ڈانٹ دیا۔ "۔چھی چھی .....اس پر شک کرتے ہو؟ اس ادھے سے مرد پر!۔"

بس اس سے آگے ادھے نے نہیں سنا۔ الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ آتے ہی گلی میں اس نے لیٹے ہوئے ایک کتے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ بہت مارا اور جیسے خود ہی زخمی ہو کر اپنی کھولی میں جا کر لیٹ گیا۔

اگلے دن سے اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ لوگوں کو بہت حیرت ہوئی۔ جس نے بھی اس سے کوئی کام کہا' ادھے نے پوچھا "پیسے دو گے؟"

"پیسے؟..... تمہیں پیسے کیا کرنے ہیں؟۔"

"کچھ بھی کروں!.....۔"

دھیرے دھیرے ادھے کے صندوق میں' کئی طرح کے نوٹ اور سکے جمع ہونے لگے۔

یہ اصل بات سے پہلے کی بات ہے..... اور اصل بات یہ ہے کہ چھ مہینے بعد رادھا کی شادی ہو گئی..... زور زور سے ریکارڈ بج رہے تھے۔ اور موڑ سے بینڈ بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ ادھے کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ اس کے تھرکنے والے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ صندوق کے سارے پیسے نکالے اور چھترپور سوسائٹی کی "سی" بلڈنگ کے تیرہ نمبر فلیٹ کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ تیرہ نمبر فلیٹ میں سیتہ رہتی تھی۔ اکیلی اور بدنام۔ بیشتر لوگ رات کو وقت بے وقت اس کے فلیٹ سے نکلتے ہوئے یا اندر جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ ادھے نے وہ سب دیکھا تھا۔ سمجھا بھی تھا مگر خاموش رہا اور آج.....!

معلوم نہیں فلیٹ کے اندر کیا ہوا' مگر ادھا پورے سات گھنٹے بعد سیتہ کے گھر سے نکلا جب رادھا کی ڈولی جا چکی تھی۔

اس کے بعد ادھا اکثر وہاں جانے لگا۔ لوگوں کو بہت برا لگا کہ سیتہ نے ادھے کے ساتھ بھی سمبندھ بنانے میں گریز نہ کیا۔ اور یہ بات انہیں برداشت نہیں ہوئی کہ جس عورت کے

ساتھ ان کے سمبندھ ہوں' اس کے ساتھ اس بونے کے بھی تعلقات ہوں' وہ چاہے ویشیا ہی کیوں نہ ہو..... بس سیتہ کے خلاف پوری سوسائٹی سرگرم ہو گئی..... ایک دو نوجوانوں نے ادھے کو پیٹ بھی دیا..... ادھا تلملا اٹھا..... مار کھا کے وہ پھر سیتہ کے یہاں پہنچا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ شاید کچھ بیمار تھی۔ ادھے نے سیدھے سپاٹ لفظوں میں کہا۔ "سیتہ میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

سیتہ نے اس کی طرف دیکھا' اور "ہوں" کہہ کے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

ادھے نے اسے بازو سے پکڑ کے اپنی طرف کیا۔ "کیوں؟ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں آدمی نہیں ہوں؟ کیا تو بھی مجھے..... ادھا سمجھتی ہے؟۔"

سیتہ نے اس کی طرف آنکھ بھر کے دیکھا اور کہا: "مجھے سونے دے ادھے! میری طبیعت ٹھیک نہیں!۔"

ادھے کے ہاتھ سے سیتہ کی بانہہ چھوٹ گئی۔ "ٹھیک ہے' پھر مر! جہنم میں جا۔" یہ کہہ کے وہ گھوما۔ دھڑاک سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور سیڑھیاں اتر گیا۔

اصل بات یہ بھی نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد بھی سال بھر تک ادھا چھتر پور سوسائٹی میں ہی رہا..... اڑتی اڑتی خبریں اسے سیتہ کے بارے میں ملتی رہتی تھیں..... "سی" بلڈنگ سے گزرنا اس نے قصداً کم کر دیا تھا..... کسی نے اسے بتایا "سیتہ کے بچہ ہوا ہے" اور یہ بات چھتر پور سوسائٹی کے لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے ..... سیتہ کی جان کے پیچھے پڑ گئے..... "اسے نکالو..... فلیٹ چھوڑو۔"! پھر بھی سیتہ نے کسی طرح چھ مہینے نکال لئے۔

اور یہ ابھی کل کی بات ہے کہ ادھا اپنے راشن کا تھیلا پیٹھ پر لادے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ "سی" بلڈنگ کے نیچے بہت ساری بھیڑ جمع ہے۔ اس نے پوچھا بھی نہیں مگر کسی نے بتایا کہ سیتہ نے زہر کھا لیا ہے۔ ادھا تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف بھاگا۔ وہ بھول گیا کہ اس کی پیٹھ پر راشن کا تھیلا ہے اور وہ اسے چھوڑ بھی سکتا ہے..... جانے کیوں' لوگ اسے راستہ بھی دیتے رہے۔ اور آخر وہ تیرہ نمبر فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا سیتہ کی لاش ابھی پلنگ پر ہی پڑی تھی' اور چھ مہینے کا بچہ لاش سے کھیل رہا تھا۔

سارے کمپاؤنڈ میں پروفیسر کی آواز گونج رہی تھی۔ "یہ بچہ تم میں سے ہی کسی کا ہے۔ تم سب آتے رہے ہو اس کے پاس! میں جانتا ہوں' تم میں اتنی انسانیت تو ہے کہ چندہ کر کے لاش کو جلا دو گے..... مگر اس بچے کو..... میں پوچھتا ہوں' کون قبول کرے گا؟۔"

سب کے سب بت بنے کھڑے رہے۔

اچانک ادھے کے ہاتھ سے راشن کا تھیلا نیچے پھسل گیا۔ سب اس کی طرف دیکھتے رہ گئے..... اس نے دھیرے دھیرے قدموں سے جا کر بچے کو اٹھایا اور بنا کسی طرف دیکھے' اسے کندھے سے لگائے' بھیڑ میں سے گزرتا ہوا' سوسائٹی کے کمپاؤنڈ سے باہر چلا گیا۔

پروفیسر کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

"تم سب ادھورے ہو۔ آدھے ہو اور جسے تم ادھا کہتے ہو' دیکھو دیکھو وہ کتنا پورا ہے۔ کتنا مکمل.....!۔"

اُترن

واجدہ تبسم

"نکو اللہ' میرے کو بہوت شرم لگتی ہے۔"

"ایو اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ میں نئیں اتاری کیا اپنے کپڑے؟"

"اوں....." چمکی شرمائی۔

"اب اتارتی کی بولوں انا بی کو؟" شہزادی پاشا جن کی رگ رگ میں حکم چلانے کی عادت رچی ہوئی تھی' چلا کر بولیں۔ چمکی نے کچھ ڈرتے ڈرتے' کچھ شرماتے شرماتے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پہلے تو اپنا کرتا اتارا' پھر پاجامہ.... پھر شہزادی پاشا کے حکم پر جھاگوں بھرے ٹب میں ان کے ساتھ کود پڑی۔

دونوں نہا چکیں تو شہزادی پاشا ایسی محبت سے جس میں غرور اور مالکن پن کی گہری چھاپ تھی' مسکرا کر بولیں۔ "ہور تو یہ بتا کہ اب تو کپڑے کون سے پین رئی؟" کپڑے؟ "چمکی بے حد متانت سے بولی" یہی اچ میرا نیلا کرتا پاجامہ' یہی اچ؟" شہزادی پاشا حیرت سے چلا کر ناک سکوڑتے ہوئے بولیں "اتے گندے' بدبو والے؟ پھر پانی نہانے کا فائدہ؟"

چمکی نے جواب دینے کے بجائے الٹا ایک سوال جڑ دیا۔ "ہور آپ کیا پین رئے پاشا؟" میں "شہزادی پاشا بڑے اطمینان اور فخر سے بولیں "وہ میری بسم اللہ کے وقت چمک چمک کا جوڑا میری دادی ماں بنائے تھے۔ وئی اچ۔ مگر تو نے کائے کو پوچھی؟"

چمکی ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی' پھر ہنس کر بولی' "میں سوچ رہی تھی" شہزادی پاشا نے حد تجسس سے پوچھا "کیا؟" کہ ایک دم ادھر سے انا بی کی تیز چنگھاڑ سنائی دی۔ "ہو پاشا یہ میرے

کو حمام میں سے بھگالے کو تم اس اجاڑ ماری چوٹی کے ساتھ کیا مٹانے مار لیتے بیٹھیں۔؟ جلدی نکلو' نئیں تو بی پاشا کو ابی جا کر بولھوں۔" اپنی سوچی ہوئی بات چمکی نے جلدی سے کہہ سنائی۔

"پاشا میں سوچ رہی تھی کہ کبھی آپ ہو میں" اوڑھنی بدل" بہنان بن گئے تو آپ کے کپڑے میں بھی پہن لے سکتی نا؟"

"میرے کپڑے؟ تیرا مطلب ہے کہ وہ سارے کپڑے جو میرے صندوقاں بھر بھر کو رکھے پڑے ہیں!"

جواب میں چمکی نے ذرا ڈر کر سر ہلایا۔ شہزادی پاشا ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ "ایو کتنی بے وقوف چھوکری ہے! آگے تو تو نوکرانی ہے تو میری اترن پہنچتی ہے ہور عمر بھر اترن ہی پہنیں گی۔"

پھر شہزادی پاشا نے بے حد محبت سے جس میں غرور اور فخر زیادہ خلوص کم تھا' اپنا ابھی ابھی کا نہانے کے لیے اتارا ہوا جوڑا چمکی طرف اچھال دیا۔ "یہ لے یہ اترن پہن لے۔ میرے پاس تو بہوت کپڑے ہیں۔"

چمکی کو غصہ آگیا "میں کائے کو پہنوں' آپ پہنو نا میرا یہ جوڑا۔" اس نے اپنے میلے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ شہزادی پاشا غصہ سے ہنکاری "انا بی! انا بی...."

انا بی نے زور سے دروازہ کو بھڑ بھڑایا اور دروازہ' جو صرف ہلکا سا بھڑا ہوا تھا' پاٹوں پاٹ کھل گیا۔ "اچھا تو آپ دونوں صاحبان ابھی تک ننگے اچ کھڑے وئے ہیں....! انا بی ناک پر انگلی رکھ کر بناوٹی غصے سے بولیں۔

شہزادی پاشا نے جھٹ اسٹینڈ پر ٹنگا ہوا نرم نرم گلابی تولیہ اٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ چمکی یوں ہی کھڑی رہی۔ انا بی نے اپنی بیٹی کی طرف ذرا غصے سے دیکھا "ہور تو پاشا لوگاں کے حمام میں کائے کو پانی نہانے کو آن تری؟"

"یہ انوں شہزادی پاشا نے بولے کی تو بھی میرے ساتھ پانی نہا۔"

انابی نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو' پھر جلدی سے اسے حمام سے باہر کھینچ کر بولیں "جلدی سے جا نوکر خانے میں..... نئی تو سردی وردی لگ گئی تو مرے گی۔" "پن میرے کپڑے....." وہ شرم سے ذرا سمٹی۔

"اب یہ چکٹ گوند کپڑے تکو پہن' وہ لال پیٹی میں شہزادی پاشا پرسوں اپنا کرتا پاجامہ دیے تھے۔ وہ جا کو پہن لے۔"

وہیں ننگی کھڑی کھڑی وہ سات برس کی ننھی سی جان بڑی گہری سوچ کے ساتھ رک رک کر بولی۔" امنی جب میں ہور شہزادی پاشا ایک برابر کے ہیں تو انوں میرے اترن کیوں نئیں پہنتے؟"

"ٹھیر ذرا' میں مما کو جا کو بولیتوں کی چمکی میرے کو ایسا بولی....."

لیکن انابی نے ڈر کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ "اگے پاشا انے تو چھنال پاگل ہولی ہو گئی ہے۔ ایسے دیوانی کی باتاں کائے کو اپنے مما سے بولتے آپ؟ اس کے سنگات کھیلنا' نہ بات کرنا۔ چپ اس کے نام پر جوتی مار دیو آپ۔"

شہزادی پاشا کو کپڑے پہنا کر' کنگھی چوٹی کر کے' کھانا وانا کھلا کر' جب سارے کاموں سے نپٹنت ہو کر انابی اپنے کمرے میں پہنچی تو دیکھا کہ چمکی ابھی تک ننگا جھاڑ بنی کھڑی ہے آؤ دیکھا نہ تاؤ انہوں نے اپنا بیٹی کو دھنکنا شروع کر دیا۔

"جس کا کھاتی اسی سے لڑائیاں مول لیتی۔ چھنال گھوڑی! ابھی کبھی بڑے سرکار نکال باہر کر دیے تو کدھر جائیں گے۔ اتے نخرے؟"

انا بی کے حسابوں تو یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ وہ شہزادی پاشا کو دودھ پلانے واسطے رکھی گئی تھیں۔ ان کے کھانے پینے کا معیار تو لازماً وہی تھا جو بیگمات کا تھا کہ بھئی وہ نواب صاحب کی اکلوتی بچی کو دودھ پلاتی تھیں۔ کپڑا لتا بھی بے حساب تھا کہ دودھ پلانے والی کے لیے صاف ستھرا رہنا لازمی تھا۔ اور سب سے زیادہ مزے تو یہ تھے کہ ان کی اپنی بچی کو شہزادی پاشا کی بے حساب اترن لازمی تھا۔ کپڑے لتے ملنا تو ایک طے شدہ بات تھی! حد یہ کہ اکثر چاندی کے زیور اور کھلونے تک بھی اترن میں دیے جاتے تھے۔ ادھر وہ حرافہ تھی کہ جب سے ذرا ذرا ہوش سنبھال رہی تھی بس یہی ضد کیے جاتی تھی کہ میں بی پاشا کی اترن کیوں پہنوں؟ کبھی کبھار تو آئینہ دیکھ کر بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کہتی "امنی میں تو بی پاشا سے بھی زیادہ خوبصورت ہوں نا؟ پھر تو انہوں میری اترن پہنانا؟"

انابی ہر گھڑی ہولتی تھیں۔ بڑے لوگ تو بڑے لوگ ہی ٹھیرے۔ اگر کسی نے سن گن پا لی کہ موئی انا نااصل کی بیٹی ایسے ایسے بول بولتی ہے تو ناک چوٹی کاٹ کر نکال باہر نہ کر دیں گے؟ ویسے بھی دودھ پلانے کا زمانہ تو مدت ہوئی بیت گیا تھا۔ وہ تو ڈیوڑھی کی روایت کہیے کہ انا لوگوں کی مرے بعد ہی چھٹی کی جاتی تھی۔ لیکن قصور بھی معاف کیے جانے میں قابل ہو تو ہی معافی ملتی ہے۔ ایسا بھی کیا؟ انا بی نے چمکی کے کان مروڑ کر اسے سمجھایا۔ "آگے سے کچھ بولی تو

یاد رکھ۔ تیرے کو عمر بھر بی پاشا کی اترن پہننا ہے۔ سمجھی کی نئیں۔ گدھے کی اولیاد!"

گدھے کی اولیاد نے اس وقت زبان تو سی لی لیکن ذہن میں لاوا پکتا ہی رہا۔

تیرہ برس کی ہوئیں تو شہزادی پاشا کی پہلی بار نماز قضا ہوئی۔ آٹھویں دن گل پاشی ہوئی تو ایسا زرتار جھم جھماتا جوڑا مما نے سلوایا کہ آنکھ ٹھیرتی نہ تھی۔ جگہ جگہ سونے کے گھنگھروؤں کی جوڑیاں ٹنکوائیں کہ جب بی پاشا چلتیں تو چھن چھن پازیبیں سی بجتیں۔ ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق وہ حد سے سوا قیمتی جوڑا بھی اترن میں دے دیا گیا۔ انا بی خوشی خوشی وہ سوغات لے کر پہنچیں تو چمکی جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ دار اور حساس ہو چکی تھی۔ دکھ سے بولی "امنی مجبوری ناطے سے لینا ہور بات ہے لیکن آپ ایسی چیزاں لے کر خوش مت ہوا کرو۔"

"اگے بیٹا" وہ راز داری سے بولیں "یہ جوڑا اگر بکانے کو بھی بیٹھے تو دو سو کلدار روپے تو کہیں نئیں گئے۔ اپن لوگاں نصیبے والے ہیں کہ ایسے ڈیوڑھی میں پڑے۔"

"امنی" چمکی نے بڑی حسرت سے کہا۔ "میرا جی بولتا کی میں بھی کبھی بی پاشا کو اترن دیوں؟"

انابی نے سرپیٹ لیا اگے تو بھی جوان ہو گئی ہے۔ ذرا عقل پکڑ۔ ایسی ویسی باتاں کوئی سن لیا تو میں کیا کروں گی۔ ماں ذرا میرے بڈھے چونڈے پر رحم کر۔"

چمکی ماں کو روتا دیکھ کر خاموش رہ گئی۔

مولوی صاحب نے دونوں کو ساتھ ہی ساتھ قرآن شریف اور اردو قاعدہ شروع کرایا تھا۔ بی پاشا نے کم اور چمکی نے زیادہ تیزی دکھائی دونوں نے جب پہلی بار قرآن شریف کا دور ختم کیا تھا تو بڑی پاشا نے ازراہ عنایت چمکی کو بھی ایک ہلکے کپڑے کا نیا جوڑا سلوا دیا تھا۔ ہرچند کہ بعد میں اسے بی پاشا کا بھاری جوڑا بھی اترن میں مل گیا تھا۔ لیکن اسے اپنا وہ جوڑا جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس جوڑے سے اسے کسی قسم کی ذلت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہلکے زعفرانی رنگ کا جوڑا..... جو کتنے ہی سارے جگمگاتے لس لس کرتے جوڑوں سے سوا تھا۔

اب جب کہ خیر سے شہزادی پاشا ضرورت بھر پڑھ لکھ بھی چکی تھیں۔ جوان بھی ہو چکی تھیں۔ ان کا گھر بسانے کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ ڈیوڑھی سناروں' درزیوں' بیوپاریوں کا مسکن بن چکی تھی۔ چمکی یہی سوچے جاتی کہ وہ تو شادی کے اتنے بڑے ہنگامے کے دن بھی اپنا وہی جوڑا پہنے گی جو کسی کی اترن نہیں تھا۔

بڑی پاشا جو واقعی بڑی مہربان خاتون تھیں' ہمیشہ اپنے نوکروں کا اپنی اولاد ہی کی طرح

خیال رکھتی تھیں۔ اس لیے شہزادی پاشا کے ساتھ وہ چمکی کی شادی کے لیے بھی اتنی ہی فکر مند تھیں۔ آخر نواب صاحب سے کہہ کر انہوں نے ایک مناسب لڑکا چمکی کے لیے تلاش کر ہی لیا۔ سوچا کہ شہزادی پاشا کی شادی کے بعد اسی جھوڑ جھمکے میں چمکی کا بھی عقد پڑھا دیا جائے۔

اس دن جب شہزادی پاشا کے عقد کو صرف ایک دن رہ گیا تھا اور ڈیوڑھی مہمانوں سے ٹھسا ٹھس بھری پڑی تھی اور لڑکیوں کا ٹڈی دل ساری ڈیوڑھی کو سر پر اٹھائے ہوئے تھا' اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی شہزادی پاشا' پیروں میں مہندی لگواتے ہوئے چمکی سے کہنے لگیں' تو سسرال جائے گی تو تیرے پیروں میں مہندی لگاؤں گی۔"

"ایو خدا نہ کرے!" انا بی نے پیار سے کہا" اس کے پانواں آپ کے دشمناں چھوئیں۔ آپ ایسا بولے سو بس ہے۔ بس اتنی دعا کرنا پاشا کی آپ کے دولہے میاں ایسا ویسا شریف دولہا اس کا نکل جائے۔"

"مگر اس کی شادی کب ہورتی جی.....؟" کوئی چلبلی لڑکی پوچھ بیٹھی۔

شہزادی پاشا وہی بچپن والی غرور بھری ہنسی ہنس کر بولیں "میری اتی ساری اترن نکلے گی تو اس کا جہیز تیار سمجھو۔"

اترن..... اترن..... اترن..... کئی ہزار سوئیوں کی باریک باریک نوکیں جیسے اس کے دل کو چھید گئیں۔ وہ آنسو پیتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر چپ چاپ پڑ گئی۔ سر شام ہی لڑکیوں نے پھر ڈھولک سنبھالی۔ ایک سے ایک واہیات گانا گایا جا رہا تھا۔ پچھلی رات رت جگا ہوا تھا۔ آج پھر ہونے والا ہے۔ پرلی طرف صحن میں ڈھیروں چولہے جلائے باورچی لوگ انواع و اقسام کے کھانے تیار کرنے میں مشغول تھے۔ ڈیوڑھی پر رات ہی سے دن کا گمان ہو رہا تھا۔

چمکی کا روتا ہوا حسن نارنجی جوڑے میں اور بھی کھل اٹھا۔ یہ جوڑا وہ جوڑا ہے جو اسے احساس کمتری کے پاتال سے اٹھا کر عرش کی بلندیوں پر بٹھا دیتا تھا۔ یہ جوڑا کسی کی اترن نہیں تھا۔ نئے کپڑوں سے سلا ہوا یہ نیا جوڑا جو اسے زندگی بھر میں بس ایک ہی بار نصیب ہوا تھا ورنہ ساری عمر تو شہزادی پاشا کی اترن پہنتے ہی گزری تھی۔ اور چونکہ جہیز بھی تمام تر ان ہی کی اترن پر مشتمل تھا اس لیے باقی کی ساری عمر بھی اسے اترن استعمال کرنا ہو گی۔ "لیکن بی پاشا..... ایک سید زادی اور کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ تم بھی دیکھ لینا۔ تمے ایک سے ایک پرانی چیز مجھے استعمال کرنے کو دیے نا؟ اب تو دیکھنا....." ملیدے کا تھال اٹھائے وہ دولہا والوں کی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ ہر طرف چراغاں ہو رہا تھا۔ یہاں بھی وہی چہل پہل تھی جو دلہن والوں کے محل

میں تھی۔ صبح عقد خوانی جو تھی۔

اتنے ہنگامے اور اتنی بڑی کوٹھی میں کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ پوچھتی پاچھتی وہ سیدھی دولہا میاں کے کمرے میں جا پہنچی۔ ہلدی مہندی کی رتیوں رسموں سے تھکے تھکائے دولھا اپنی مسہری پر دراز تھے۔ پردہ ہلا تو وہ مڑے اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

گھٹنوں تک لمبا زعفرانی کرتا۔ کسی کسی پنڈلیوں پر منڈھا ہوا تنگ پاجامہ۔ ہلکی ہلکی کامدانی کڑھا ہوا زعفرانی دوپٹہ۔ روئی روئی بھیگی بھیگی گلابی آنکھیں چھوٹی آستینوں والے کرتے میں سے جھانکتی گداز بانہیں۔ بالوں میں موتیا کے گجرے پروئے ہوئے۔ ہونٹوں پہ ایک قاتل سی مسکراہٹ۔ یہ سب نیا نہیں تھا لیکن ایک مرد جس کی پچھلی کئی راتیں کسی عورت کے تصور میں بیتی ہوں' شادی سے ایک رات پہلے خطرناک ہو جاتا ہے چاہے وہ کیسا ہی شریف ہو۔

رات جو دعوت گناہ ہوتی ہے۔

تنہائی جو گناہوں کی ہمت بڑھاتی ہے۔ چمکی نے انہیں یوں دیکھا کہ وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے چمکی جان بوجھ کر مونہہ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ تلملائے سے اپنی جگہ سے اٹھے اور ٹھیک اسی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں کے گوشوں سے چمکی نے انہیں یوں دیکھا کہ وہ ڈھیر ہو گئے۔

"تمہارا نام؟" انہوں نے تھوک نگل کر کہا۔

"چمکی!" اور ایک چمکیلی ہنسی نے اس کے پیارے پیارے چہرے کو چاند کر دیا۔

"واقعی تم میں جو چمک ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ تمہارا نام چمکی ہوتا۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے شانوں پر رکھا۔ خالص مردوں والے لہجے میں نہیں جو کسی لڑکی کو پٹانے سے پہلے خواہ مخواہ ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں بلکہ لرزتے ہوئے ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولے "یہ تھال میں کیا ہے؟"

چمکی نے قصداً ان کی ہمت بڑھائی "آپ کے واسطے ملیدہ لائی ہوں۔ رت جگا تھا نا رات۔" اور اس نے تلوار کے بغیر انہیں گھائل کر دیا۔ "مونہہ میٹھا کرنے کو۔" وہ مسکرائی۔

"ہم ملیدے ولیدے سے مونہہ میٹھا کرنے کے خائل نہیں ہیں ہم تو..... ہاں....." اور انہوں نے ہونٹوں کے شہد سے مونہہ میٹھا کرنے کو اپنے ہونٹ بڑھا دیئے۔ اور چمکی ان کی بانہوں میں ڈھیر ہو گئی۔ ان کی پاکیزگی لوٹنے..... خود لٹنے..... انہیں لوٹنے کے لیے۔

وداع کے دوسرے دن ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق جب شہزادی پاشا اپنی اترن اپنا

سہاگ کا جوڑا اپنی انا' اپنی کھلائی کی بٹیا کو دینے گئیں تو چمکی نے مسکرا کر کہا "پاشا میں زندگی بھر آپ کی اترن استعمال کرتی آئی مگر اب آپ بھی..... اور دیوانے کی طرح ہنسنے لگی۔ "میری استعمال کر لی ہوتی چیز اب زندگی بھر آپ بھی....." اس کی ہنسی تھمتی ہی نہ تھی۔

سب لوگ یہی سمجھے کہ بچپن سے ساتھ کھیلی سہیلی کی جدائی کے غم نے عارضی طور سے چمکی کو پاگل کر دیا ہے!